تدبّر

لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور - پاکستان

تدبّر لاہور

جاری کردہ
مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:
خالد مسعود

شمارہ 76
جون 2002ء
ربیع الثانی 1423ھ

مجلس ادارت
عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)
محبوب سُبحانی
سعید احمد
سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے
سالانہ 50.00 روپے
بیرون ملک 250.00 روپے
(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ وتبصرہ
تدبر حدیث شرح صحیح بخاری (جلد اول) 2
عبداللہ غلام احمد

تدبر قرآن
مقدمہ تفسیر سورہ بقرہ (۳) حمید الدین فراہیؒ 13

تدبر حدیث
درس صحیح بخاری 18
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی
درس موطا امام مالک 30
امین احسن اصلاحی / ماجد خاور

مقالات
نظام نبوت ورسالت خالد مسعود 37
قرآنی تمثیلات اور ان کا فلسفہ 44
عبدالخالق فاروقی

افادات اصلاحی
رویت باری کا مسئلہ 54
امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ : مولانا امین احسن اصلاحیؒ
- حاشیہ : مشتمل بر اخذ وتلخیص از تفسیر تدبر قرآن: خالد مسعود
- سفید زمین اور نیلے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز 20x30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

تدبر حدیث

(جلد اول)

شرح مؤطا امام مالکؒ مولانا امین احسن اصلاحیؒ

(کتاب الزکوۃ، البیوع، الاقضیۃ، الحدود، الاشربۃ، العقول، الجامع، وغیرہ کے منتخب ابواب)

- ترتیب وتدوین : خالد مسعود، سعید احمد
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- مالکی فقہ کی آراء کا محاکمہ
- خوبصورت طباعت وجلد بندی
- سائز 20x30/8 صفحات 544
- قیمت: 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ سمن آباد لاہور

عبداللہ غلام احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تدبر حدیث۔ شرح صحیح بخاری (جلد اول)

الحمد للہ، مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے دروس 'صحیح بخاری' کا پہلا حصہ 'تدبر حدیث، شرح صحیح بخاری (جلد اول)' کے نام سے مرتب ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب تدبر حدیث کے سلسلہ کتب کی تیسری جلد ہے جو صحیح بخاری کے منتخب ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں بخاری شریف کے شروع سے لے کر کتاب الوضوء تک مسلسل اور اس کے بعد کتاب البیوع سے کتاب الاجارات تک مسلسل ابواب شامل ہیں۔

مولانا اصلاحیؒ کو ابتدا ہی سے قرآن شریف کی طرح حدیث شریف سے بھی قلبی لگاؤ تھا۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد پانچ سال تک امام حمید الدین الفراہیؒ سے علوم قرآن سیکھنے کا خاص موقع ملا۔ ۱۹۳۱ء میں وہ اپنے علاقہ کے جید عالم مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوریؒ (شارح ترمذی و مصنف تحفۃ الاحوذی) جن کی سند حدیث نہایت عالی ہے، کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے فیض صحبت سے مستفید ہونے اور حدیث شریف پڑھنے کا موقع عنایت فرمائیں۔ محدث مبارک پوریؒ نے ضعف اور پیری کے باوجود ان کی یہ درخواست قبول کر لی۔ مولانا اصلاحیؒ نے نہایت انہماک اور دل جمعی کے ساتھ ان سے ترمذی شریف پڑھی اور استاذ سے روایت کی اجازت حاصل کی۔

طویل علمی اور سیاسی تجربہ کے بعد مولاناؒ نے محسوس کیا کہ اس دور میں مذہب کو جس چیلنج سے سابقہ ہے اس کا جواب دینا ہمارے علماء حضرات کے بس کا کام نہیں۔ ملک میں دو قسم کے علیحدہ علیحدہ متوازی نظام تعلیم چل رہے ہیں۔ ایک طریقہ تعلیم تو وہ ہے جو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رائج ہے جس سے اعلیٰ ترین فنی، اقتصادی اور سیاسی ماہرین اور نہایت قابل سرکاری نوکر اور حکمران تو تیار ہوتے ہیں مگر ان کی اکثریت اپنے دین سے بے بہرہ ہوتی ہے اور وہ جدید فکر و فلسفہ کے زہر کے اثر سے محفوظ نہیں ہوتے۔ دوسری طرف دینی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے معاشرہ کے جدید تقاضوں اور ان سے متعلقہ علوم سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اور ان کے لیے کاروبار زندگی کا سنبھالنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کی دوعملی ختم کر کے اس کے اندر وحدت پیدا کی جائے۔ یہ کام افراد کے کرنے کا نہیں بلکہ حکومت کے کرنے کا ہے مگر حکومت اس کام کو کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

تاہم مولاناؒ نے اس سلسلہ میں محدود پیمانے پر تجرباتی جدوجہد کا آغاز کیا اور یہ پروگرام بنایا کہ فی الحال کالجوں اور یونیورسٹیوں سے فارغ شدہ اشخاص میں سے جو افراد بھی دستیاب ہو جائیں ان کو قرآنی فکر و فلسفہ سے روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ جون ۱۹۶۲ء میں انہوں نے 'حلقہ تدبر قرآن' قائم کیا اور اپنے گھر ہی پر قرآن مجید اور صحیح مسلم کا علمی اور تحقیقی درس شروع کر دیا اور ساتھ ہی وہ اپنی تفسیر تدبر قرآن لکھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اگست ۱۹۸۰ء میں مولاناؒ تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل سے فارغ ہوئے تو انہوں نے اپنی تمام تر توجہ دین کے دوسرے ماخذ۔۔۔ حدیث شریف۔۔۔ کی طرف مرکوز کر دی۔ اگرچہ مولاناؒ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جب تعلیم و تدریس اور تحقیق کا کام مشکل ہو جاتا ہے پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور حلقہ تدبر قرآن کو وسعت دے کر اسے ادارہ تدبر قرآن و حدیث کی شکل دی اور اس کے زیر اہتمام تدبر حدیث پر کام شروع کر دیا۔ اس ضعیف العمری میں ان کے لیے اپنے ہاتھ سے تحریر کرنا ممکن نہ رہا تو ادارہ نے ان کے دروس و تحقیقات کو آڈیو کیسٹوں پر ریکارڈ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کیسٹوں کی مدد سے اصول تدبر حدیث پر مولانا کے لیکچر 'مبادی تدبر حدیث' کے نام سے، اور موطا امام مالک کے دروس 'تدبر حدیث شرح موطا امام مالک (جلد اول)' کے نام سے مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں، مولانا اصلاحیؒ کی عمر بیاسی برس سے تجاوز کر چکی تھی، تو انہوں نے ناتوانی اور پیری کے باوجود صحیح بخاری پر درس دینے کا بیڑا اٹھایا اور نہایت مستعدی کے ساتھ مسلسل درس دیتے رہے۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث نے ان دروس کو بھی ریکارڈ کر لیا۔ یہ دروس ترتیب و تدوین کے بعد اس ادارہ کے سہ ماہی رسالہ 'تدبر' میں باقاعدگی سے چھپتے رہے اور اب ان کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شرح موطا کی طرح نہایت عمدہ کاغذ پر اور اعلیٰ طباعتی معیار پر شائع کی گئی ہے۔

مولانا اصلاحیؒ کے جلیل القدر استاد محدث مبارک پوریؒ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حدیث میں اعتماد سند پر ہوتا ہے۔ اگر سند قابل اعتماد ہو تو حدیث کے متن پر بحث لاحاصل ہے۔ مولانا اصلاحی سند کو حدیث پرکھنے کے لیے محض ایک ذریعہ قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک متن حدیث کی نسبت چونکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہوتی ہے اس لیے اس کو ہر اعتبار سے جانچ کر اس کی صحت کا فیصلہ کرنا لازم ہے۔ احادیث کی شرح کرتے ہوئے مولاناؒ بالعموم اسناد سے تعرض نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال میں رواۃ کی تحقیق پر امام بخاریؒ نے جو رائے قائم کی ہے وہ ہمارے لیے کفایت کرتی ہے۔ البتہ درایت کے پہلو سے وہ متن حدیث پر تحقیق کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اصول حدیث پر دروس کے دوران انہوں نے فرمایا:

"سند کو کسی حدیث کے صدق و کذب کے فیصلہ میں ایک اہم، بلکہ اولین عامل کی حیثیت

حاصل ہے۔ ....

سند کے تمام محاسن، لطائف، اہمیت اور اس کے مطابق معیار ہونے کے باوجود اس میں بعض ایسے فطری خلا رہ جاتے ہیں جن کی تلافی کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کی صحت کو جانچنے کے لیے سند کے سوا بعض دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جائیں۔ مجرد سند پر اعتبار کر کے کسی روایت کی صحت اور حسن وقبح کے متعلق پوری طرح سے اطمینان نہیں کیا جا سکتا"۔

(مبادیٔ تدبر حدیث، ص ۹۱، ۹۲)

مولانا اصلاحیؒ متن حدیث پر تحقیق اس لیے بھی ضروری خیال کرتے ہیں کہ راویانِ حدیث بالعموم روایت بالمعنی کرتے ہیں اس لیے مختلف طرق حدیث کے متن میں خاصا اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کو مختلف متون حدیث پر غور کے بعد صحیح ترین روایت کا تعین کر کے رفع کیا جا سکتا ہے۔ صحیح اور کامل روایت کے متعین کرنے کے لیے متن حدیث پر تحقیق ضروری ہے۔

ائمہ حدیث نے احادیث کو سمجھنے اور ان کی صحت وسقم کا فیصلہ کرنے کے لیے جو اصول ومبادی قائم کیے ہیں، مولانا اصلاحیؒ ان کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے خیال میں وہ ایسے معقول اور فطری ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ مولاناؒ نے تدبر حدیث کے لیے پانچ ایسے بنیادی رہنما اصول پیش کیے ہیں جن کی مدد سے حدیث کا طالب علم نہ صرف جگہ جگہ ایسی الجھنوں سے محفوظ رہے گا جن سے ٹھوکر کھانے اور بھٹکنے کا احتمال ہے بلکہ وہ فہم حدیث کی راہ کو اپنے لیے ہموار پائے گا۔ مولاناؒ نے انہی اصولوں کی روشنی میں صحیح بخاری کا مطالعہ کیا اور اس کا درس دیا ہے اور دورانِ درس حدیث کی تشریح کے ساتھ ساتھ اصول فہم حدیث کو بھی واضح کرتے چلے گئے ہیں۔

اب ہم مولانا اصلاحیؒ کے بتائے ہوئے پانچ رہنما اصولوں کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور یہ دکھاتے ہیں کہ انہوں نے حدیث کی شرح میں ان اصولوں کا اطلاق کیسے کیا ہے:

۱۔ پہلا اصول یہ ہے کہ حق و باطل میں امتیاز اور دین وشریعت کی ہر چیز کی جانچ کے لیے کسوٹی قرآن مجید ہے۔ اگر کسی حدیث کے بارے میں تردد ہوگا تو روایت قرآن مجید ہی کی ترازو میں تولی جائے گی۔ اس کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کی ہوئی روایت میں یہ امکان موجود ہے کہ اس چیز کو دین بنا لیا جائے جو دین نہیں ہے۔ قرآن کی کسوٹی پر پورا نہ اترنے والی روایت یا تو موضوع ہوگی یا ہم تک صحیح حالت میں منتقل نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ بات عقلاً اور شرعاً محال ہے کہ رسول ﷺ کی کوئی بات اللہ تعالیٰ کی بات کے خلاف ہو۔ چنانچہ اس بات پر اہل فن کا اتفاق رہا ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہوگی وہ منکر ہے۔ فن حدیث

کے عظیم خادم امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ آپ کی اس قول کے بارے میں کیا رائے ہے کہ "سنت کتاب اللہ پر حاکم ہے" تو انہوں نے فرمایا کہ میں یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا بلکہ سنت تو قرآن کی تفسیر کرتی، اس کی تعریف کرتی اور اس کی مجمل باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔ باب "**تفاضل اهل الايمان في الاعمال**" کے تحت آنے والی حدیث پر مولاناؒ نے یوں بحث کی ہے:

ترجمہ حدیث: "ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل دوزخ دوزخ میں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہے اس کو دوزخ سے نکالو، تو وہ اس حالت میں نکالے جائیں گے کہ جل کر کوئلہ ہو چکے ہوں گے۔ پھر ان کو نہر حیا یا نہر حیات (امام مالک کو شک ہے) میں ڈال دیا جائے گا تو وہ وہاں سے اس طرح اگیں گے کہ جیسے دانے کسی نم زمین کے کنارے پر اگ پڑتے ہیں۔ دیکھا نہیں وہ کس طرح لپٹے ہوئے زرد زرد نکلتے ہیں۔ وهیب کہتے ہیں کہ عمرو نے حیاۃ کا لفظ استعمال کیا ہے اور **خردل من ايمان** کی جگہ **خردل من خير** کہا۔

وضاحت: اس روایت میں بہت بڑا اشکال ہے، جس کے باعث یہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ اشکال یہ ہے کہ اس میں مجرمین کے دوزخ سے نکالے جانے کا تصور دیا گیا ہے جب کہ اس تصور کا قرآن میں کہیں اشارہ تک نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہود کے عقائد کے ضمن میں جہاں آیت **قالوا لن تمسنا النار الا اياما معدودة** میں ان کے جہنم میں بس چند روزہ سزا پانے کے عقیدہ کا ذکر کیا ہے تو وہاں اس کو ان کا من گھڑت عقیدہ بتایا ہے، جس کی بنیاد کسی وحی آسمانی پر نہیں ہے۔

قرآن مجید کی رو سے اللہ تعالیٰ آخرت میں ایک ایسی ترازو نصب کرے گا جو اعمال کی حقیقی قدر و قیمت کو تول کر بتا دے گی اور یہ ممکن نہیں ہوگا کہ رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی خیر یا کوئی شر ایسا رہ جائے جس کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔ اس ترازو میں اعمال کے تلنے کے بعد جن لوگوں کی میزان بھاری ہوگی وہ جنت میں اور جن کی میزان ہلکی ہوگی وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔ **فاما من ثقلت موازينه فهو في عيشة راضية و اما من خفت موازينه فامه هاوية** (القارعہ: ۷۔۸) "تو جس کے پلے بھاری ہوں گے وہ تو دل پسند عیش میں ہوگا اور جس کے پلے ہلکے ہوئے تو اس کا ٹھکانہ کھڈ ہوگا"۔ جنت اور دوزخ میں یہ داخلہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ **خالدين فيها** کے الفاظ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے آئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کی رو سے جن لوگوں کے لیے جہنم کی سزا کا فیصلہ ہوگا وہ اس سے کبھی بھی نکل نہ سکیں گے۔

جہنم کے کسی دور میں ٹھنڈا ہو جانے کا تصور بھی قرآن میں کہیں موجود نہیں، البتہ باطنیہ کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہیں سے ابن عربی اور دوسرے صوفیوں کی تحریروں کے ذریعے یہ تصور ہمارے دینی لٹریچر میں بھی آ گیا ہے۔ اس زمانے میں سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کی وکالت کی ہے۔ ان کے استدلال کی بنیاد قرآن کے الفاظ الا ما شاء ربک (ہود ۱۱: ۱۰۷) ''مگر جو تیرا رب چاہے'' پر ہے۔ حالانکہ اس موقع پر یہ الفاظ جس طرح جہنم کے متعلق آئے ہیں اسی طرح جنت کے متعلق بھی آئے ہیں۔ ان الفاظ سے خلود فی النار کے اس عقیدہ کی نفی نہیں ہوتی جو قرآن میں متعدد مقامات پر نہایت غیر مبہم طریقہ سے بیان ہوا ہے، بلکہ مشیت الٰہی کے فیصلہ کن ہونے کا اثبات ہوتا ہے۔

اس روایت کے مضمون میں یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ خیر کا کوئی ذرہ اگر اتنا قیمتی تھا کہ اس کی بنا پر مجرمین کو دوزخ سے نکالا جا سکتا تھا تو وہ خدا کی میزان سے پہلے کیوں نظر انداز ہو گیا۔ نیز جہاں تک عقائد کا تعلق ہے ان کا تجزیہ کر کے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں آدمی میں اتنے فیصد توحید ہے، باقی شرک ہے۔ یا تو آدمی میں پوری توحید ہو گی یا پورا شرک ہو گا۔ اگر کسی شخص کے عقیدے کو شرک قرار دے دیا جائے گا تو قرآن کی رو سے یہ بات حتمی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کبھی معاف کرنے والا نہیں۔ اس لیے ایسے شخص کا دوزخ سے نکالے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ اس طرح عقیدہ اور عمل دونوں کے اعتبار سے اس حدیث میں بیان کردہ عقیدہ سمجھ میں نہیں آتا۔

خاص اس روایت میں یہ اشکال بھی ہے کہ جہنم میں جلنے کے بعد مجرمین نہر حیاۃ میں ڈالے جائیں گے تو زرد رو زرد اگیں گے۔ اس کے بعد ان کا کیا بنے گا اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں ہوئی۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عقائد کی بنیاد لازماً قرآن پر ہونی چاہیے۔ کوئی عقیدہ خبر واحد سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہاں اس خبر واحد کا عقیدہ چونکہ قرآن کے بیانات سے متناقض ہے لہٰذا اس معاملے میں قرآن ہی کے بیان کو حاکم سمجھا جائے گا''۔ (صفحہ: ۲۰۷۔۲۰۷)

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کی طرح حدیث شریف کا بھی اپنا ایک مجموعی نظام ہے جس سے ہٹ کر نہ تو کسی حدیث کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کی تاویل و توجیہ ٹھیک طور پر ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہر حدیث احادیث کے مجموعی نظام کا جزو سمجھی جائے گی۔ جزو کا اپنے مجموعی نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی حدیث اپنے مجموعی نظام سے بے جوڑ ہو گی تو وہ رد کر دی جائے گی۔ مختلف احادیث میں تناقض کی صورت میں احادیث کا یہ مجموعی نظام ہی ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اہل تصوف کے ہاں جو روایات رائج ہیں وہ بیشتر احادیث کے مجموعی نظام سے متعارض اور بے جوڑ ہیں۔ باب 'اثم

من کذب علی النبی ﷺ' پر بحث کرتے ہوئے مولانا یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''ترجمہ: ابن حراش کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ فرماتے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ لوگو، میری طرف کوئی جھوٹ منسوب نہ کرنا کیونکہ میرے اوپر جس کسی نے جھوٹ بولا تو وہ آگ میں داخل ہو گا۔

وضاحت: جو بات نبی ﷺ نے نہیں فرمائی وہ بات آپ کی طرف منسوب کر دی جائے تو یہ آپ کے اوپر تہمت تراشنے کے مترادف ہے۔ ایسے مفتری شخص کو آگ میں داخل ہونا ہو گا۔ فلیلج اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن خبر کے معنی میں ہے یعنی یہ کہ وہ لازماً دوزخ میں پڑے گا۔ امر کے صیغے میں بیان کرنے کا فائدہ اس انجام کو قطعیت کے ساتھ بتانا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی شخص نبی ﷺ کی طرف غلط بات منسوب کر دے تو اس سے بڑا کوئی حادثہ نہیں ہو سکتا کیونکہ پیغمبر کی بات شریعت کا حکم ہوتا ہے۔ ایک غلط بات کو ایک مؤکد حکم کے طور پر پیش کرنے سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اور اس طرح دین کو مسخ کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے ایسا کرنے کی ممانعت ہے اور اس حرکت پر سخت عذاب کی وعید ہے۔

کچھ لوگوں کا قول ہے کہ ''کذب علی'' ممنوع ہے، ''کذب لہ'' ممنوع نہیں۔ یعنی اگر آپ دین کی حمایت میں کوئی جھوٹ تراشیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ یہ اسی قول کی برکت ہے کہ صوفیوں نے جھوٹی روایتوں کا انبار لگا دیا۔ کذب لہ کے تحت انہوں نے فضائل، ثواب اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو اللہ کے دین کی حمایت کے لیے وضع کر کے سارے دین کا تیاپانچا کر دیا۔ اسلام کا مزاج معتدل ہے۔ اس میں انہوں نے رہبانیت کو بھی گھسا دیا، اور برہمنیت اور افلاطونیت کو بھی۔ سب سے زیادہ اخلاقیات کو مسخ کیا۔ فی الجملہ ان لوگوں میں کوئی شخص زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ لے دے کے امام غزالی ہیں۔ ان کو بھی پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جبریل امینؑ بھی ان کے بتائے ہوئے معیار پر پورا نہیں اتر سکتے۔ جھوٹی اور فضول روایات ہر باب میں لا کر اخلاقیات کا معیار اتنا اونچا بنا دیتے ہیں کہ اس پر نہ خود لکھنے والے اور نہ ہی کوئی دوسرا پورا اتر سکتا ہے۔ یہ سب کچھ پیغمبر ﷺ کی تعلیم کے خلاف ہے۔ میرے نزدیک کذب لہ کا یہ فلسفہ سب سے بڑا کذب علی النبی ہے۔ تو جس نے دین کو اس طرح مسخ کیا، وہ دوزخ میں پڑے گا''۔

(صفحہ: ۱۹۸، ۱۹۷)۔

۳۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ حدیث کی اصل زبان ٹکسالی عربی ہے۔ اگرچہ احادیث کی روایت بالعموم بالمعنی ہوتی ہے تاہم صحیح احادیث کا ایک خاص معیار ہے جو بہت اعلیٰ ہے۔ احادیث پر غور کرتے ہوئے اس معیار کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ان احادیث کو مقدم رکھنا چاہیے جو زبان کے اعتبار سے عہد نبوت و صحابہ کی

زبان سے ہم آہنگ ہوں۔ حدیث کے طالب علم کے لیے نہ صرف عہد نبوت و رسالت کی زبان کی مہارت ضروری ہے بلکہ اس کے ذوق کی تربیت بھی اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ اس زبان کو بعد کے ادوار کی زبان سے ممتاز کر سکے۔ صفحہ ۸۷ پر مولانا نے ''ظلم'' کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

''حقیقت میں ظلم کا لفظ تین معنوں میں قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ایک یہ کہ شرک کر کے اپنی جان پر ظلم ڈھانا، دوسرے کسی کی حق تلفی کرنا یا اس پر زیادتی کرنا، اور تیسرے اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا نہ کرنا۔ ہمارے ہاں یہ لفظ اگر صرف دوسروں کی حق تلفی یا ان پر زیادتی کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو یہ عجمی ذوق کے سبب سے ہے۔ ورنہ عربی میں یہ اپنے تینوں معنوں میں بلاتکلف مستعمل ہے اور صحابہ کرام اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے''۔

۴۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کی طرح حدیث شریف کے فہم میں کلام کے عموم و خصوص، اس کے موقع و محل اور اس کے خطاب کو سمجھنا ضروری ہے۔ عموم و خصوص کے تحت احادیث پر غور و فکر کے دوران یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کہاں کلام بظاہر عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے۔ اسی طرح کہاں کلام بظاہر خاص ہے لیکن اس سے مراد عام ہے۔ اس کی مثال کے لیے ہم صفحہ ۹۷ سے ایک اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں:

''اس روایت میں ''الناس'' سے اگر سب لوگ مراد لے لیے جائیں یعنی مشرکین عرب بھی اور یہود و نصاریٰ، مجوس اور ہندو بھی تب تو آنحضرت ﷺ اور صحابہ کا عمل اس کے خلاف پڑتا ہے، اس لیے کہ اس روایت کا تقاضا ہے کہ جب تک سب لوگ اللہ اور اس کے رسول کی شہادت اور نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کریں ان کی جان نہ چھوڑی جائے۔ لیکن عملاً ایسا نہیں کیا گیا۔ کتنی قومیں ہیں جو اہل صلح میں شامل ہیں اور ان سے معاہدے کیے گئے۔ صحابہ کے دور میں مجوس کا معاملہ پیش آیا تو ان کو بھی مشابہ اہل کتاب قرار دے کر معاہدہ کیا گیا اور پھر تمام غیر مسلموں کو مشابہ اہل کتاب قرار دے کر یہی معاملہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''الناس'' کا لفظ ہے تو عام، لیکن مفہوم اس کا خاص ہے۔ آنحضرتؐ کا فرمان سورۃ توبہ کی آیت ۵ پر مبنی ہے۔ یہ سورہ اتری ہی مشرکین مکہ کے بارے میں ہے اس لیے یہاں پر مشرکین مکہ کے سوا کسی اور کو مراد لینے کا موقع ہی نہیں ہے۔ چونکہ مشرکین مکہ کی طرف آنحضرت ﷺ کی بعثت خصوصی اور براہ راست تھی اور آپ نے خود براہ راست ان پر حجت تمام کی تو سنت الٰہی یہ ہے کہ جس قوم کی طرف رسول براہ راست بھیجا جاتا اور اس کے ذریعے سے حجت تمام کر

دی جاتی ہے تو پھر رسول کی نافرمانی کی صورت میں اس قوم کے لیے دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا کوئی عذاب آ کر ان کو ختم کر دیتا ہے، جس کی مثال عاد، ثمود، مدین وغیرہ کے ہاں ملتی ہے۔ یہ سب قومیں عذاب الٰہی سے ختم ہوئیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نبی کے ساتھی اتنی طاقت اور جمعیت رکھتے ہوں کہ لڑ کر مشرکین کو ختم کر سکیں تو لڑ کر ختم کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے ہاں ملتی ہے۔ اس معاملہ میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت میں لوگوں پر حجت تمام کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ان کے اندر رسول مبعوث کر دینا ہے۔ اس کے بعد تو صرف کشف حقیقت باقی رہ جاتا ہے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے۔ لہٰذا رسول کی تکذیب کے بعد قوم کے لیے یہی مقدر ہوتا ہے کہ اس کو ختم کر دیا جائے۔ چاہے عذاب الٰہی سے، یا رسول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ قتال میں۔ مشرکین مکہ کا مقدر یہی قتال تھا''۔ (صفحہ: ۷۵، ۷۶)

اسی طرح موقع و محل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا بڑا اہم ہے۔ اگر اس کا ادراک نہ ہو تو بڑی الجھنیں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ اس کی مثال صفحہ ۶۴ پر حب الانصار کے بارے میں ملے گی۔ اقتباس پیش خدمت ہے:

''اس حدیث میں انصار (بحیثیت ایک گروہ) کی محبت ایمان کی نشانی بتائی گئی ہے۔ میرے نزدیک اس کا ایک پس منظر ہے جس میں انصار کی محبت کو ایمان کی علامت قرار دینے کی ایک خاص وجہ تھی۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے، اور روایات اس کی تائید کرتی ہیں، کہ ایک زمانے میں انصار کے متعلق یہ پروپیگنڈا بڑی تیزی سے شروع کر دیا گیا کہ انہوں نے مسلمانوں کو مدینہ بلا کر یہاں کے لوگوں پر مہاجرین کی مصیبت لا دی ہے۔ ہم اچھے خوشحال تھے لیکن مہاجرین کے بوجھ نے ہمارے سارے عیش کو گدلا کر دیا ہے۔ قرآن میں اس صورت حال کی طرف اشارہ موجود ہے۔ سورہ منافقون میں منافقین کی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ انہوں نے ایک غزوہ کے دوران کہا کہ مدینہ پہنچ کر طاقتور گروہ کمزور مہاجرین کو شہر سے نکال باہر کرے گا۔ ان کا منصوبہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر کر دیا اور اس اقدام کی نوبت نہ آئی۔ معلوم ہوتا ہے اسی دور میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب انصار کی محبت ایمان اور نفاق میں امتیاز کی علامت بن چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کی ہجرت کے بعد اس کو پناہ دینے اور اس کی مدد کرنے کے عمل کی نظیر اس آسمان کے نیچے کوئی اور نہیں۔ اس کے برعکس اس کی

مخالفت یا اس کے ساتھیوں کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا کرنا صریح نفاق ہے۔ صرف منافقین ہی یہ حرکت کر سکتے تھے۔ انصار کے حق میں محبت کی تلقین کی وجوہ کو سمجھنے کے لیے اس موقع ومحل کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ موقع ومحل معلوم نہ ہو تو گمان کیا جا سکتا ہے کہ انصار نے اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے یہ بات بنالی۔ حالانکہ ایسی بات نہیں۔

اس حدیث میں انصار کے علاوہ دوسرے گروہوں سے محبت کی نفی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سب سے مقدس گروہ مہاجرین کا تھا جن کو انصار پر بھی شرف حاصل ہے۔ ان سے ہر مسلمان کو محبت ہونی چاہیے۔ اسی طرح باقی ہر گروہ جو کسی طریقے سے دین کی خدمت کرتا ہے، اس کی محبت بھی ایمان کی علامت ہے۔ اس کی طرف اشارہ اوپر کی روایت میں موجود ہے۔ لہذا آپ اپنی پوری تاریخ میں جن لوگوں یا گروہوں کی خدمت کو دین کے لیے قابل قدر پائیں ان سے محبت کرنا ضروری ہے''۔

موقع ومحل کے تعین کے ساتھ ساتھ روئے سخن، مخاطب کے حالات اور سائل کے سوال کے پس منظر کا تعین کرنا بھی ضروری ہے ورنہ حدیث کو سمجھنے میں بہت دشواری پیش آئے گی۔ اس کی مثال مندرجہ ذیل حدیث کی تشریح میں ملتی ہے:

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کون سا عمل سب سے افضل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کے اوپر ایمان۔ پھر سوال کیا گیا، اس کے بعد؟ فرمایا، اللہ کے راستے میں جہاد۔ پھر پوچھا گیا، اس کے بعد کون سا؟ فرمایا، حج خالص۔

وضاحت: حج مبرور سے مراد ایسا حج ہے جس میں گناہ یا کسی کی حق تلفی کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو۔ اس روایت میں یہ مشکل ہے کہ ایسے ہی سوالات آنحضرت ﷺ سے مختلف مواقع پر کیے گئے تو آپ نے ان کے مختلف جواب دیے، تو یہ اختلاف کیوں ہے؟ اس روایت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد جہاد کا ذکر ہے حالانکہ ایمان اور جہاد میں بڑا فاصلہ ہے۔ جہاد زندگی کے ان اعمال میں سے نہیں جن پر زندگی میں مداومت واجب ہے۔ یہ ان اعمال میں سے ہے کہ جب ضرورت پیش آئے تو بڑی نیکی، اور جب نفیر عام ہو جائے تو سب سے بڑا فرض بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس نماز، روزہ، زکوۃ روزمرہ کی چیزیں ہیں جن پر مداومت دین میں مطلوب ہے۔ اس سے بھی عجیب تر یہ بات ہے کہ روایت میں جہاد کے بعد حج مبرور کا ذکر آیا ہے، حالانکہ حج بھی بعض حالات میں فرض نہیں ہوتا۔ اس کی فرضیت کی بہت سی شرطیں ہیں۔ پھر یہ کہ زندگی میں یہ ایک مرتبہ کافی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑی نیکی ہے لیکن دوسری

عبادتوں کے مقابل میں اس کو افضل ترین تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ سوالوں کے جواب سائل کے لحاظ سے دیے جاتے ہیں۔ سائل کا سوال کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جواب دینے والا حکیم ہو تو وہ جانتا ہے کہ اس کا کیا جواب دینا ہے۔ اس کی نظیریں حدیث میں بہت ملتی ہیں۔ اہل بدو میں سے کوئی آتا ہے تو نبی ﷺ اس کا جواب اور طریقے سے دیتے ہیں تاکہ وہ واپس جا کر لوگوں کو سکھائے۔ اہل علم میں سے کوئی بات پوچھتا ہے تو حضور اسی سوال کا جواب اور طریقے سے دیتے ہیں۔ میرے نزدیک اس روایت کی کوئی معقول توجیہ ہو سکتی ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت نے جواب سوال کرنے والے شخص اور موقع کے لحاظ سے دیا ہے۔ دوسری توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ روایت نامکمل ہو اور اس میں تمام پہلو صحیح طور پر تعبیر نہ کیے جا سکے ہوں''۔ (صفحہ: ۷۷-۷۶)

۵۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ دین اور عقل وفطرت میں منافات ہرگز نہیں ہے۔ اللہ تعالی نے دین کو عقل وفطرت کے اوپر ہی مبنی فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (اسی دین فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا) جس طرح قرآن مجید کی تمام دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے اسی طرح حدیث شریف بھی سراسر عقل وفطرت پر مبنی ہے اس لیے حدیث میں کوئی بات عقل وفطرت کے صریحاً خلاف نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی بات عقل کے صریحاً خلاف نظر آئے تو اس پر اچھی طرح سے غور کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ یا تو اپنی غلطی واضح ہو جائے یا حدیث کا ضعف سمجھ میں آ جائے۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ عقل کی رسائی محدود ہے۔ وہ دھوکا بھی کھا سکتی ہے اور رشوت بھی قبول کر لیتی ہے اس لیے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اگر کسی روایت میں حدیث اور عقل وفطرت میں منافات نظر آئے تو اس پر مسلسل غور جاری رکھا جائے یہاں تک کہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جائے۔ اس معاملے میں سہل انگاری کی ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ جو لوگ عقل سے صحیح طور پر کام نہیں لیتے یا اپنی عقل کو خواہشات کا تابع بنا لیتے ہیں وہ لوگ یہاں زیر بحث نہیں۔ اس اصول کی وضاحت کے لیے دو مثالیں ذیل میں درج کی جا رہی ہیں:

۱۔ ''اللہ کا دین اپنے مزاج کے لحاظ سے بہت سہل ہے کیونکہ یہ دین فطرت ہے۔ اس میں ایسی بات کیوں کر ہو سکتی ہے جو سب کو اڑنگا دے کر پچھاڑ دے۔ لیکن جو شخص اس کے ساتھ دھینگا مشتی کرے گا تو یہ اس کو پچھاڑ دے گا۔ وہ دین پر غالب نہیں آ سکتا۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص یہ ارادہ کر لے کہ میں تو ہر معاملہ میں آخری نقطہ پر ہی قدم رکھوں گا تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ روایت میں آیا ہے کہ بعض صحابہؓ نے کہا کہ حضور ﷺ کا کیا ہے، آپ کے تو سارے اگلے پچھلے

گناہ بخش دیے گئے ہیں۔ لہٰذا ہم تو ساری ساری رات نماز پڑھیں گے، زندگی بھر روزہ رکھیں گے، شادی بیاہ نہیں کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو ان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔
اس زمانہ میں صوفیا کے اس طرح کے واقعات کا بہت چرچا کیا جاتا ہے کہ وہ حج کے لیے پیدل گئے تو ہر قدم پر نفل پڑھے۔ لوگ ایسے ایسے فضائل بیان کرتے ہیں جو نا قابل یقین ہی نہیں نا قابل عمل بھی ہیں۔ اسی طرح کی چیزوں کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دین سے دھینگا مشتی نہ کرو ورنہ مار کھا جاؤ گے''۔ (صفحہ: ۹۵۔۹۴)

۲۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پانی کی کتنی مقدار ہو کہ جس میں نجاست مل جائے تو وہ ناپاک ہو جائے گا۔ اس بارے میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ پانی کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، اگر نجاست گر جائے تو پانی ناپاک ہو جائے گا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں، قلیل پانی ہوا تو ناپاک ہو جائے گا اور کثیر ہو گا تو ناپاک نہیں ہو گا۔ پھر اس کے بعد اختلاف ہو جاتا ہے کہ کثیر کی تعریف کیا ہے۔ اس میں بڑی بحثیں ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ اس کا تعلق فقہ سے نہیں بلکہ عقل عام (Common sense) سے ہے۔ ہم یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک جوہڑ ایسا ہے کہ جس میں ایک آدمی پیشاب کر دے تو ناپاک ہو جائے گا اور ایک ایسا ہے کہ ناپاک نہیں ہو گا۔ لیکن ناپاک نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ جو صاحب چاہیں اس میں پیشاب کر دیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آپ جانور نہ بنیں۔ پانی کی صفائی سے زیادہ اہم یہ ہے کہ آدمی مہذب انسان بنے۔ اس طرح پیشاب کرنا، چاہے ماء دائم ہو یا ماء جاری، جائز نہیں ہے۔ ایسا کرنا تہذیب کے، صفائی کے اعلیٰ نصب العین کے اور انسانیت کے اعلیٰ نقطہ نظر کے بالکل منافی ہے''۔ (صفحہ: ۳۲۹)

یوں کتاب اس طرح کے علمی نکات سے بھری ہوئی ہے۔ مولانا کا انداز بیان نہایت سہل ہے۔ حدیث کے طلبہ اس علمی کاوش کو تدبر حدیث کے مقصد کے لیے بے حد مفید پائیں گے۔

حمید الدین فراہیؒ/ترجمہ: ڈاکٹر عبیداللہ فراہی

مقدمہ تفسیر سورہ بقرہ

۔۳۔

۱۰۔ سورہ کے اجزاء اور ان کے نظام پر ایک اجمالی نظر

پیش نظر رہے کہ یہ سورہ ایک مکمل ٹکڑا ہے جس کا ہر جزء غایت درجہ حسن نظام کے ساتھ ایک دوسرے سے مربوط اور باہم دگر پیوستہ ہے۔ یہ بات اس وقت واضح ہو جائے گی جب ہم اس سورہ کی تفسیر کریں گے۔ بایں ہمہ یہ سورہ چھ اجزاء پر ترتیب دی ہوئی ہے: مقدمہ، چار ابواب اور خاتمہ۔

جہاں تک مقدمہ کا تعلق ہے یہ قرآن، نبوت اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے اور یہی ایمان کی حقیقت ہے۔ کیوں کہ ایمان عبارت ہے اس کتاب پر ایمان لانے سے جو تمام آسمانی کتابوں، سارے انبیاء، جملہ اوامر و نواہی اور بنیادی اور صحیح عقائد سب کو شامل ہے۔

رہے چاروں ابواب تو وہ سورہ میں اسی ترتیب سے آئے ہیں جس ترتیب سے رسول اللہ ﷺ کی صفات حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا میں آئی ہیں جو تعمیر کعبہ کے وقت انہوں نے کی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''اے ہمارے رب تو ان ہی میں سے ایک رسول ان میں مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے''۔ (بقرہ: ۱۲۹)

اور ان کی دعا پوری کر دینے کے سلسلہ میں فرمایا:

> ''چنانچہ ہم نے تم ہی میں سے ایک رسول تم میں بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے''۔ (بقرہ: ۱۵۱)

ایک اور مقام پر فرمایا:

> ''اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان ہی میں سے ایک رسول ان میں مبعوث

فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔ (آل عمران: ۱۶۴)

دوسری جگہ فرمایا:

''وہی ہے جس نے امیوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا، ان کو پاک کرتا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔

(سورہ جمعہ: ۲)

دعائے ابراہیم میں تزکیہ کا ذکر آخر میں آیا ہے کیوں کہ وہ غایت ومقصد کے حکم میں ہے اور اس کی تکمیل کے موقع پر اسے مقدم کر دیا ہے تاکہ ہم اس بات کو جان لیں کہ جس پیغمبر کے لیے انہوں نے دعا کی تھی اس نے اسے اپنا مقصد اولین قرار دیا ہے اور اس کی تکمیل کی ہے اور یہ علم وعمل میں کامل ہونے کے بعد ہی مکمل ہوتا ہے۔ نیز اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہی پیغمبر نبی آخر الزماں ہے کیونکہ وہ اس کام کو انجام دے رہا ہے جو نفس کی سعادت کا منتہائے کمال ہے۔ مزید براں تکمیل دعا میں تزکیہ کو مقدم کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ وہی پیغمبر ہے جس کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔ کیوں کہ ان کی دعا میں جو چیز آخری غایت کے حکم میں تھی اس کو اس پیغمبر نے اپنا اولین کام اور اصل مقصد بنالیا ہے اور اسی سے اپنے کام کا آغاز کیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دینے لگا تاکہ تزکیہ کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

جس طرح تزکیہ کی ایک ابتدا اور انتہا ہے اور تلاوت آیات سے اس کا ربط ہے اسی طرح حکمت کی بھی ابتدا وانتہا ہے جو تزکیہ کے پہلے قدم سے شروع ہوتی ہے اور اس کے پورے ہونے پر تکمیل کو پہنچتی ہے۔

۱۔ چنانچہ تلاوت آیات تزکیہ وتعلیم سے پہلے بطور تمہید کے ہے۔

۲۔ اور اصول دین کی تعلیم تزکیہ کی راہ میں پہلا قدم ہے۔

۳۔ اور احکام دین کی تعلیم اس کا دوسرا قدم ہے۔

۴۔ اور حکمت کی تعلیم اس راہ میں تیسرا قدم ہے اور اس سے وہ تزکیہ پورا ہو جاتا ہے جو علم وعمل سے اس زندگی میں حاصل ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا چاروں امور کے لحاظ سے چار ابواب قائم ہوتے ہیں۔

پہلا باب ان واضح دلائل اور روشن آیات کی تلاوت سے متعلق ہے جو آپ کی رسالت کو جس

کا کتب سابقہ میں وعدہ کیا گیا تھا ثابت کرنے والی ہیں اور یہ آپ کے پہلے وصف ''رسولا منهم يتلوا عليهم آياته'' کے اعتبار سے ہے۔

دوسرا باب تزکیہ کے ابتدائی مرحلہ یعنی ذکر، شکر، صبر، توکل، توحید، تفکر، ایمان، امانت داری اور برو تقوی پر مشتمل ہے اور یہ آپ کے دوسرے وصف ''ویزکیهم'' کے لحاظ سے ہے۔

تیسرا باب ان امور سے متعلق ہے جن کو اللہ تعالی نے منصفانہ طرز حکومت، پاکیزہ قوانین شریعت اور صاف ستھرے آداب زندگی کی صورت میں مقرر فرمادیا ہے جو حکمت کے نظری اور عملی دونوں ہی پہلوؤں میں معاون ہوتے ہیں اور یہ آپ کے تیسرے وصف ''ويعلمهم الكتاب'' یعنی تعلیم شریعت کے اعتبار سے ہے۔

چوتھا باب اس حکمت کی تحصیل سے متعلق ہے جو کامل اطاعت سے حاصل ہوتی ہے اور یہ جان و مال کی قربانی، خلق خدا کے ساتھ ہمدردانہ سلوک اور معاملات میں نرمی اور لطف ومہربانی کے ذریعہ خواہشات اور نفسانیت کے غلبہ سے پوری طرح نجات حاصل کر لینے کا نام ہے۔ اور جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو اس وقت نفس پر سے تمام برائیوں کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور وہ ہر طرح کی نجاست سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ حظیرۃ القدس میں اسے داخلہ ملتا ہے اور حریم انس میں پہنچ کر وہ سکون پاتا ہے۔ اور اسے وہ زندگی جینے کو ملتی ہے جو سب سے اعلی واشرف ہے۔ اور کیا وہ زندگی اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتی ہے کہ اسے اللہ تعالی کی مرضی کے مطابق گزارا جائے یہاں تک کہ نفس ہوا وہوس کی قید سے آزاد ہو جائے، جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

''اے ایمان والو! خدا اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ وہ تمہیں اس چیز کی دعوت دے رہا ہے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے''۔ (سورہ انفال: ۲۴)

امت جب خود کو اپنے رب کے حوالہ کر دیتی ہے اور اس کے حضور جان و مال کو بطور نذرانہ پیش کر دیتی ہے تو زندہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالی اپنی سنت کے موافق اس چیز میں اس کو برکت دیتا ہے جو اس نے نذر کی تھی۔ چنانچہ اسے نور درخشاں، پاکیزگی تام اور نصرت وحکمرانی سے نوازتا ہے تاکہ اس امت کے واسطے سے تمام قوموں کو برکت دے۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا چوتھا وصف ہے، یعنی حکمت کی تعلیم دینا اور اس دوسرے تزکیہ کو پورا کرنا جو اس حکمت کے تابع ہے جسے سب سے بڑی نعمت اور کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا ہے:

''وہ حکمت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے، اور جسے حکمت عطا ہوئی اسے خیر کثیر کا خزانہ

علا۔ اور یاد دہانی تو صرف عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں''۔ (بقرہ:۲۶۹)

اس وقت نعمت کا اتمام ہوتا ہے اور دنیا میں سلوک کی راہ فطرت کی استعداد کے لحاظ سے مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد آخرت میں ان پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت سے یہ تزکیہ بھی پورا ہو جائے گا، جیسا کہ عہد شکنوں کے ذکر میں فرمایا ہے:

''اور نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا''۔

(آل عمران: ۷۷)

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ روز قیامت اپنے پرہیزگار بندوں کو پاک کرے گا جیسا کہ فرمایا ہے:

''ان کے سینوں کی کدورتیں ہم نکال دیں گے وہ بھائی بھائی کی طرح آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے''۔ (حجر: ۴۷)

رسول اللہ ﷺ کے ان اوصاف کی اس سورہ کے نظم سے مطابقت آپؐ اور آپؐ پر نازل ہونے والی وحی کے درمیان مطابقت کو بتا رہی ہے۔ حضرت عائشہ کا یہ قول اسی امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے

فان خلق نبی اللہ ﷺ کان القرآن (صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین و قصرھا، باب جامع صلوۃ اللیل)

﴿اللہ کے رسول ﷺ کا اخلاق حقیقت میں قرآن تھا﴾

یہ اس وجہ سے ہے کہ معلم کو اس کی تعلیم کے آئینہ میں دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ سورہ ایک طرح سے رسول اللہ ﷺ کی صفات یا پورے قرآن کا آئینہ ہے کیوں کہ اس نے رسالت سے متعلق تمام امور کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے، اور تمام سورتوں کے بالمقابل سورہ فاتحہ کے ساتھ زیادہ قریبی تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ پہلی فصل میں گزر چکا ہے۔ یہ چاروں ابواب کی تفصیل تھی جو ہم نے بیان کر دی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ تلاوت آیات پہلی چیز ہے اور تعلیم کتاب و شریعت اس کے تابع ہے۔ رہا تزکیہ اور حکمت کا معاملہ تو ان کے دو پہلو ہیں: ایک تعلیم کتاب سے پہلے، اور وہ حکمت اور تزکیہ کے بنیادی امور ہیں جیسے توحید، پاکدامنی اور جود و کرم، یہ وہ اعلیٰ اخلاق ہیں جن پر تفصیلی قوانین شریعت کی بنیاد ہے۔ اور دوسرا تعلیم کتاب و شریعت کے بعد جو حکمت اور تزکیہ کی تعلیم کا آخری مرحلہ ہے۔ گویا تعلیم کتاب (یعنی شرائع) کو حکمت اور تزکیہ سے گھیر دیا گیا ہے۔

اور یہ کوئی مخفی امر نہیں کہ کتاب و حکمت میں وہی نسبت ہے جو نسبت اسلام اور ایمان میں ہے یا

جو نسبت تورات اور انجیل میں ہے جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ ہے:

''اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب و حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دے گا''۔

(آل عمران: ۴۸)

یہ لف و نشر کا ایک اسلوب ہے۔

اور حکمت اور تزکیہ میں مناسبت کا پہلو یہ ہے کہ حکمت عقل کی جانب سے آتی ہے جبکہ تزکیہ قلب کی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن دونوں باہم دگر پیوستہ ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ عقل کی نورانیت اور قلب کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس حقیقت کی طرف رہنمائی ''ھدی للمتقین'' کہہ کر کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل اس لفظ کے ذیل میں ملے گی۔

رہا اس سورہ کا اختتامی حصہ تو وہ ان تمام امور کا جامع ہے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے یعنی عقائد، شریعت کے بنیادی احکام اور ان پر ثابت قدمی اور ان کی مدافعت میں جان کو قربان کر دینا۔ باب کے آخر میں نصرت اور مغفرت کی دعا ہے جو ان سب کے نتیجہ کے طور پر آئی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہوگی کہ سورہ کے مطالب کے اندر جو نظم ہے وہ نہایت محکم اور پوری صحت ترتیب کے ساتھ ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کا سابق اپنے لاحق کے لیے وسیلہ کا کام دے رہا ہے۔ اس سورہ میں جو دلائل ہیں وہ ایمان تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں اور ایمان اعمال صالحہ تک لے جاتا ہے اور اعمال صالحہ کی تکمیل حکمت سے ہوتی ہے۔ پھر ان دونوں سے تزکیہ اپنے علمی اور عملی ہر دو پہلو کو مکمل کر کے پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ یہی وہ تزکیہ ہے جو نفس کا منتہائے کمال اور اس کی فلاح کا ضامن ہے۔

یہ سورہ کا ایک مجموعی نظام ہے جسے یہاں پیش کیا گیا ہے۔ رہا اس کے اجزاء کا تفصیلی نظم تو وہ اس وقت آپ کے سامنے آئے گا جب سورہ کے ایک ایک جزء پر ہم نظر ڈالیں گے۔

امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

(کتاب الوکالہ کی روایات)

باب اذا باع الوکیل شیأ فاسدا فبیعه مردود

باب: اگر وکیل فاسد چیز کی بیع کرے تو اس کی بیع واپس ہوگی

حدثنا اسحٰق حدثنا یحییٰ بن صالح حدثنا معاویة هو ابن سلام عن یحییٰ قال سمعت عقبة بن عبدالغافر انه سمع ابا سعید الخدریؓ قال جاء بلالؓ الی النبی ﷺ بتمر برنیّ فقال لهٗ النبی ﷺ من این هٰذا قال بلالؓ کانَ عِندنَا تمر ردِیء فَبِعتُ مِنهُ صَاعَین بِصَاعٍ لِنُطعِمَ النَّبِیَّ ﷺ فقَالَ النَّبیُّ ﷺ عِندَ ذَالِکَ اَوّہ اَوّہ عَینُ الرِّبَا عَینُ الرِّبَا لَا تَفعَل وَلٰکِن اِذَا اَرَدتَ ان تَشتَرِیَ فَبِعِ التَّمرَ بِبَیعٍ اٰخر ثُمَّ اشتَرِبِه.

ترجمہ: ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضرت بلالؓ، نبی ﷺ کی خدمت میں برنی کھجور لے کر آئے۔ آپ نے پوچھا یہ کہاں سے ملی؟ بلالؓ نے کہا ہمارے پاس ہلکی قسم کی کھجور تھی تو میں نے دو صاع کے بدلے ایک صاع یہ برنی کھجور خرید لی تاکہ نبی ﷺ کو کھلائیں۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا اوہ اوہ یہ تو بالکل ربا ہے۔ یہ تو سراسر ربا ہے، ایسا نہ کرو۔ اگر تم اس طرح خریدنا ہی چاہو تو اپنی کھجور بیچو اور اس کی قیمت سے یہ اچھی کھجور خرید لو۔

وضاحت: روایت کا پورا مفہوم یوں ہے کہ پہلے اپنی کھجور بیچو اور اس سے جو رقم ملے اس کے عوض عمدہ کھجور خرید لو۔ یہ روایت پیچھے گزر چکی ہے۔ اس میں دو اصول یاد رکھنے کے ہیں۔ ایک وہ جو عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بیان ہوا ہے کہ لا ربا الا فی النسیہ یعنی ربا صرف نسیہ یعنی ادھار میں ہو سکتا ہے، نقد میں اس کا سوال نہیں پیدا ہوتا اور دوسرا یہ کہ اگر اصناف بدل جائیں تو جس طرح چاہو خرید و فروخت کر سکتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں آنحضرت ﷺ نے سدًا للذریعہ اس طرح کے سودے سے منع فرمایا اور جب اس کا ضابطہ بتا دیا گیا تو اس حکم کی شکل بدل گئی۔

باب: الوکالة فی الوقف و نفقته و ان یطعم صدیقا له و یاکل بالمعروف

باب: وقف اور وقف کے مال کے خرچ کے بارے میں وکیل کا دائرہ کار۔ نیز یہ کہ وہ دستور کے مطابق اپنے کسی دوست کو کچھ دے دلا سکتا ہے اور خود بھی اس میں سے لے سکتا ہے۔

حدثنا قتیبة بن سعید حدثنا سفیان عن عمرو بن دینار قال فی صدقة عمرؓ لیس علی الولی جناح ان یاکل و یوکل صدیقا غیر متاثل مالا فکان ابن عمرؓ هو یلی صدقة عمرؓ یهدی للناس من اهل مکة کان ینزل علیهم.

ترجمہ: عمرو بن دینار نے حضرت عمرؓ کے صدقہ کے بارے میں یہ کہا کہ ولی کے اوپر اس معاملہ میں کوئی اعتراض نہیں کہ وہ ضرورت کے مطابق کھائے یا کسی دوست کو کھلائے البتہ مال جمع کرنے کی فکر نہ کرے اور ابن عمرؓ حضرت عمرؓ کے صدقہ کے متولی تھے۔ اہل مکہ میں سے جن کے پاس ٹھہرتے تھے، ان لوگوں کو ہدیہ بھی دیتے تھے۔

وضاحت: اس روایت کی حیثیت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک اثر کی ہے۔ جہاں تک معلوم ہے عمرو بن دینار کی ان سے ملاقات ثابت نہیں۔ گویا سند میں انقطاع ہے۔ لیکن مسئلہ ایسا ہے کہ سب کو معلوم ہے اس لیے کہ اگر کسی وقف کا کوئی متولی ہے تو وہ اس کو اپنا وقت بھی دیتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ضرورت کے مطابق خرچ لینے میں حق بجانب ہے۔ یہ چیز قرآن سے بھی نکلتی ہے۔ سورہ نساء میں جہاں یتیم کے مال کے بارے میں ذکر ہے وہاں متولی کو اجازت دی ہے کہ اگر وہ ضرورت مند ہے تو دستور کے مطابق لے سکتا ہے۔ البتہ یہ کہ کتنا لے، یہ اس کی صوابدید پر ہے۔ مال کی نوعیت، زمانے کے حالات اور اس کی ضرورت کے لحاظ سے اس کو لینا چاہیے۔ اس میں دوسرے کا دخل نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شکایت وغیرہ ہوگی تو وقف کے لیے ہر حکومت کی طرف سے کوئی انتظام ہوتا ہے تو اس کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ یہ زیادہ لے رہے ہیں، ان کو روکا جائے۔ عبداللہ بن عمرؓ اگر یہ کرتے رہے ہیں تو ان کا مسلک قرآن کے مطابق تھا۔ لیکن روایت مرفوع نہیں ہے اور اس میں انقطاع بھی ہے۔ ضعف کے ان پہلوؤں کے باوجود از روئے قرآن بات صحیح

ہے تو بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باب: الوکالة فی الحدود

باب: حدود کے معاملہ میں وکالت

وضاحت: کچھ لوگ حدود کے احکام کی بجا آوری پر مامور ہوتے ہیں۔ مثلاً جیل کا سپرنٹنڈنٹ جو کسی کو پھانسی دلواتا ہے یا کوڑے لگواتا ہے تو یہ وکیل ہی کی حیثیت سے یہ کام انجام دیتا ہے۔ یہ باب ایسے لوگوں سے متعلق ہے۔

حدثنا ابو الولید اخبرنا اللیث عن ابن شہاب عن عبیداللہ عن زید بن خالد و ابی ھریرةؓ عن النبی ﷺ قال واغْدُ یا انَیس اِلٰی امْرَاۃ ھٰذا فَاِنِ اعْتَرَفَتْ فَارْجُمْھا.

ترجمہ: زید بن خالد اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے انیس سے کہا کہ تم اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اور اگر وہ اعتراف کرلے تو اس کو رجم کردو۔

وضاحت: امام صاحب یہاں ایک طویل حدیث کا ایک ٹکڑا لے آئے ہیں کہ باب کے مضمون کو ثابت کریں۔ آنحضرت ﷺ نے کسی صاحب انیس کو اپنا وکیل بنا کر بھیجا کہ ایک ملزمہ کے پاس جا کر جرم کے بارے میں پوچھیں۔ اگر وہ زنا کا اعتراف کرلے تو پھر اس کو رجم کروادیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہوگا جب زنا کے بارے میں قرآن مجید کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ ایسی صورت میں نبی ﷺ کا عمل شریعت سابقہ پر ہوتا تھا۔ دوسری روایت میں یہ ہے بھی کہ کچھ لوگوں نے پنچایت کے طریقہ پر فیصلہ کچھ اور کیا تھا لیکن اس پر اطمینان نہیں ہوا تو آنحضرت ﷺ کے پاس آئے۔ آپ نے ان کے فیصلہ کو منسوخ کردیا اور انیس سے کہا کہ جا کر اس عورت سے پوچھو اور اگر وہ اعتراف جرم کرلے تو رجم کردو۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔

حدثنا ابن سلام اخبرنا عبدالوھاب الثقفی عن ایوب عن ابی ملیکة عن عقبة بن الحارث قال جِیْئَ بِالنُّعَیمانِ اَوِ ابنِ النُّعَیمانِ شَارِبًا فَاَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَنْ کَانَ فِی الْبَیْتِ اَنْ یَضْرِبُوا قَالَ فَکُنْتُ اَنَا فِیمَنْ ضَرَبَہٗ فَضَرَبْنَاہُ بِالنِّعَالِ وَالْجَرِیدِ.

ترجمہ: عقبۃ بن الحارث روایت کرتے ہیں کہ نعیمان یا ابن نعیمان کو اس حالت میں لایا گیا کہ وہ شراب پیے ہوئے تھا تو آنحضرت ﷺ نے گھر کے اندر جو لوگ تھے ان کو حکم دیا کہ اس کو مارو۔ وہ کہتے ہیں کہ میں

بھی ان لوگوں میں تھا جنہوں نے اس کو مارا اور ہم نے اس کو مارا جوتوں سے اور کھجور کی شاخ سے۔

وضاحت: صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ابتدائی دور کا واقعہ ہے کہ اس طریقہ سے سزا دے کر معاملہ نمٹا دیا جاتا تھا۔ یہ بات البتہ قابل غور ہے کہ شراب کی یہ سزا حدود میں شامل ہے یا تعزیرات میں۔ حدود کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں کوئی حکم بیان ہوا ہے یا پیغمبر ﷺ نے کوئی حکم دیا ہے، اور یہ بھی متعین ہو کہ اس طریقہ سے اتنی سزا دی جائے۔ شراب کی سزا قرآن میں تو ہے نہیں اور یہاں جو سزا دی ہے اس کی نوعیت تعزیری ہے کہ کچھ جوتے مارے اور کچھ چھڑی سے پٹائی کردی۔ شراب خوری کی اسی کوڑے کی سزا کا حد ہونا بظاہر ثابت نہیں ہے۔ وہ تو ایک استنباط ہے کہ آدمی شراب پی کر بہکتا ہے اور لوگوں پر تہمت لگاتا ہے تو قذف کی جو سزا ہے وہ شراب پینے والے کے لیے رکھ دی جائے۔ یہ استنباط میرے نزدیک ضعیف ہے۔ تاہم یہ دیکھنا پڑے گا کہ روایت کے لحاظ سے اس کی نوعیت کیا ہے۔ میں اس وقت اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس پر کوئی قطعی بات کروں۔ جب روایت سامنے آئے گی تب بحث ہوسکتی ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ حدود اور تعزیرات کی تعمیل میں باضابطگی اور باقاعدگی ہوگی اور کوڑے مارنے اور خود کوڑے کی نوعیت متعین ہوگی۔

باب: الوکالة فی البُدنِ و تَعاھُدُھَا

باب: قربانی کے جانوروں کے بارے میں وکالت اور ان کی نگرانی

حدثنا اسمٰعیل بن عبداللہ قال حدثنی مالک عن عبداللہ بن ابی بکر بن حزم عن عمرة بنت عبدالرحمن انھا اخبرتہ قالت عائشة انا فتلت قلائد ھَدیِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ بِیَدَیَّ ثُمَّ قَلَّدَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِیَدَیْہِ ثُمَّ بَعَثَ بِھَا مَعَ اَبِی فَلَمْ یَحْرُمْ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ شَیْءٌ" اَحَلَّہُ اللّٰہُ لَہٗ حَتّٰی نَحرَ الْھَدْیَ.

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے قربانی کے جانوروں کے پٹے اپنے ہاتھوں سے بٹے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو اپنے ہاتھوں سے باندھا، پھر ان کو میرے باپ کے ساتھ بھیجا لیکن آنحضرت ﷺ پر کوئی چیز، جسے اللہ نے ان کے لیے حلال کیا تھا، حرام نہیں ہوئی یہاں تک کہ قربانی ہوگئی۔

وضاحت: ہدی کے جانور وہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں یہ نیت ہو کہ ان کو مکہ لے جا کر قربان کیا

جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے جانوروں کی قربانی کے معاملہ میں وکیل کیا کہ وہ مکہ لے جا کر قربانی کریں۔ جانور مکہ بھیجنے کے باعث حضور پر احرام کی پابندیاں عائد نہیں ہوئیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخصت ہے کہ اس صورت میں جانوروں کی قربانی تک بھیجنے والے پر احرام کی پابندی نہیں ہوگی۔ اس لیے بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ قربانی کی نیت کے بعد پابندی ہوگی ان کا موقف غلط ہے۔ روایت صاف ہے کہ آپ قربانی کے لیے وکیل بنا سکتے ہیں۔

بَاب: اِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِوَكِيْلِهٖ ضَعهُ حَيثُ اَرَاکَ اللّٰهُ وَقَالَ الْوَكِيلُ قَد سَمِعْتُ مَا قُلتَ

باب: جب کوئی شخص اپنے وکیل سے کہے کہ اس کو آپ اس مصرف میں لائیں جو اللہ سجھا دے اور وکیل جواب دے کہ میں نے آپ کی بات سن لی

حدثنی یَحیَی بْنُ یَحیَی قَالَ قَرَاتُ علی مَالِکٍ عَن اسحٰق بْنِ عبدِاللّٰہِ انّہ سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِکٍؓ یَقُولُ کَانَ اَبُوطَلْحَۃَ اَکثَرَ الْاَنْصَارِ بِالْمَدِینَۃِ مَالًا و کَانَ اَحبُّ اَموالِہٖ اِلَیہِ بَیرحَاء و کَانَتْ مُسْتَقْبِلَۃَ الْمَسْجِدِ وَ کَانَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ یَدْخُلُھَا وَ یَشْرَبُ مِن مَاءٍ فِیھَا طَیِّبٍ فَلَمَّا نَزَلَتْ لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ قَامَ اَبُو طَلْحَۃَؓ اِلَی رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَ یَا رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ اللّٰہَ تعالی یَقُولُ فِی کِتَابِہٖ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَ اِنَّ اَحَبَّ اَموالِی اِلَیَّ بَیرُحَاء وَ انما صَدَقَۃٌ" لِلّٰہِ اَرْجُوا بِرَّھَا وَ ذُخرَھَا عِندَاللّٰہِ فَضَعْھَا یَا رَسُولَ اللّٰہِ حَیثُ شِئتَ فَقَالَ بَخٍ ذَالِکَ مَالٌ" رَائِحٌ ذَالِکَ مَالٌ" رَائِحٌ قَدْ سَمِعْتُ مَا قُلتَ فِیھَا وَ اَرٰی اَنْ تَجْعَلَھَا فِی الْاَقْرَبِینَ قَالَ اَفْعَلُ یَا رَسُولَ اللّٰہِ فَقَسَمَھَا اَبُو طَلْحَۃؓ فِی اَقَارِبِہٖ وَ بَنِی عَمِّہٖ تابعہ اسمٰعیل عن مالک و قال روح عن مالک رابح.

ترجمہ: انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہؓ مدینہ کے انصار میں سب سے زیادہ مال دار تھے اور ان کا بہترین مال ان کا باغ بیرحاء تھا جو مسجد کے سامنے تھا۔ نبی ﷺ اس میں تشریف لے جایا کرتے اور اس کا شیریں پانی پیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت اتری کہ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم اللہ کی وفاداری کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنا محبوب مال نہ خرچ کرو) تو ابوطلحہؓ اٹھے اور نبی

ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون. میرا محبوب ترین مال یہ باغ بیرحاء ہے تو وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے۔ اللہ کے ہاں اس کا ثواب اور اس کا اجر چاہتا ہوں۔ آپ جہاں چاہیں اس کو خرچ کیجئے۔ آپ نے فرمایا، بہت خوب! یہ تو بہت نفع بخش مال ہے، بہت نفع بخش مال ہے۔ میں نے تمہاری بات سن لی اور میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے اقربا میں تقسیم کر دو۔ تو انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ ایسا ہی کروں گا۔ پھر ابوطلحہؓ نے اس کو اپنے اقربا اور بنی عم میں تقسیم کر دیا۔

وضاحت: یہ روایت بہت مشہور ہے اور کئی جگہ آئی ہے لیکن امام صاحب نے جو باب باندھا ہے اس سے ان کا کیا مطلب ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حضرات صحابہؓ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کی بے حد قدر کرتے تھے اور جو حکم سنتے اسی پر فوراً عمل کرتے تھے۔ ابوطلحہؓ نے بھی ایسا ہی کیا۔ عام طور پر ذہنوں میں یہ خیال ہے کہ صدقہ غریب اور فقیر ہی کو دیا جائے تو عنداللہ اجر ہوتا ہے لیکن اس روایت سے یہ بات نکلتی ہے کہ اعزا اور اقربا کو دینے کا بھی وہی اجر ہے۔

باب: وَكَالَةُ الْاَمِينِ فِي الْخِزَانَةِ و نَحوِهَا

باب: خزانہ وغیرہ کا امین بنائے گئے شخص کی وکالت

حدثنا محمد بن العَلاءِ حدثنَا اَبُو اُسَامَۃَ عَن برید بن عبداللہ عن ابی بُردَۃَ عن ابی مُوسٰی عن النَّبِیِّ ﷺ قَالَ الخَازِنُ الْاَمِینُ الَّذِی یُنفِقُ و ربما قال الذی یُعطِی مَا اُمِرَ بِہٖ کَامِلًا مُوَفَّرًا طَیِّبًا نَفسُہٗ اِلَی الَّذِی اُمِرَ بِہٖ اَحَدُ الْمُتَصَدِّقِینَ.

ترجمہ: ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ وہ خزانچی جو امانت دار ہے اور خرچ کرتا یا اس شخص کو پورا پورا دیتا ہے، حکم کے مطابق خوشی کے ساتھ، جس کے لیے حکم دیا گیا تو وہ بھی صدقہ دینے والوں میں شریک ہے۔

وضاحت: یہ روایت معمولی الفاظ کے فرق کے ساتھ اوپر گزر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خازن جو خزانے پر مقرر ہے اور بڑی خوش دلی اور دیانت داری کے ساتھ ادائیگی کرتا ہے تو وہ صدقہ کرنے والے میں سے ایک گنا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كتاب المزارعة

ما جاء في الحرث والمزارعة

کھیتی باڑی اور بٹائی کے بارے میں روایات

بـاب: فضل الزرع والغرس اذا اكل منه و قول الله تعالىٰ أَفَرَءَيْتُم مَا تَحْرُثُونَ ءَ أَنْتُم تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ لَو نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا

باب: زراعت اور درخت لگانے کی فضیلت جب کہ اس میں سے لوگ کھائیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول کہ غور تو کرو ان چیزوں پر جن کی تم کھیتی کرتے ہو، کیا تم ان کو پروان چڑھاتے ہو یا ہم ان کے پروان چڑھانے والے ہیں؟! اگر ہم چاہیں تو ان سب کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں۔

وضاحت: صحیح بخاری کے جتنے نسخے ہیں ان میں یہ باب الگ الگ ہے اور بعض نسخوں میں یہ باب سرے سے نہیں ہے۔ توجہ اس لیے دلا رہا ہوں کہ اس پر کاوش کرنا کوہ کندن کاہ برآوردن ہے۔ قرآن کی جو آیت نقل ہوئی ہے اس کو باب سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ یہ آیت فضیلت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ تقدیر اور اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت کی تذکیر کے بارے میں ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ جو کچھ تم بوتے ہو ذرا غور تو کرو کہ کیا اس کے پروان چڑھانے میں تمہاری خدمت وحکمت کو دخل ہے یا ہم اس کو پروان چڑھاتے ہیں۔ ہم اگر چاہیں تو اس کو ریزہ ریزہ بھی کر سکتے ہیں۔

حدثنا قتيبة بن سعيد حدثنا ابو عوانة و حدثني عبدالرحمن بن المبارك حدثنا ابو عوانة عن قتادة عن انس ؓ قال قال رسول الله ﷺ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَير" أَو إِنْسَان" أَوْ بَهِيمَة" إِلَّا كَانَ لَهُ صَدَقَة" و قَالَ لَنَا مُسْلِم" حَدَّثَنَا ابان حدثنا قتادة حدثنا انس ؓ عن النبي ﷺ

ترجمہ: حضرت انس ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ کوئی مسلمان جو درخت لگاتا یا کوئی کھیتی بوتا ہے پھر اس میں سے پرندہ یا انسان یا چوپائے کھاتے ہیں تو اس کا کھایا جانا مسلمان کے لیے صدقہ بنتا ہے۔

وضاحت: کوئی شخص جو کھیتی کرتا یا درخت لگاتا ہے اور اس میں سے دوسرے اللہ کے بندوں کو پھل

جاتا ہے یا جانور کھا لیتے ہیں تو یہ اس کے لیے خسارہ نہیں ہے بلکہ اس کا صدقہ ہوگا، اور جانور اور پرندے یا چوپائے اپنا حق لے لیں گے۔ البتہ اس شخص کے مسلمان ہونے کی شرط ضروری ہے اور یہ فطری ہے، اس لیے کہ جو شخص اللہ کو اور روز جزا و سزا کو نہیں مانتا تو آخرت میں اس کے حق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمان کے لیے یہ صدقہ اس لیے بن جائے گا کہ وہ اللہ کو، روز جزا و سزا کو، اور رسول کو ماننے والا ہے اور وہ آخرت کے لیے نیک اعمال کرتا ہے۔

بـاب: ما يحذر من عواقب الاشتغال بالة الزرع او مجاوزة الحد الذى امر به

باب: کھیتی باڑی کے آلات کے ساتھ زیادہ مشغولیت اور اس حد سے جس کا حکم دیا گیا ہے تجاوز کے نتائج سے بچنا چاہیے

حدثنا عبدالله بن يوسف حدثنا عبدالله بن سالم الحمصى حدثنا محمد بن زياد الالهاني عن ابى امامة الباهلى قال و راى سكة و شياء من الة الحرث فقال سمعت النبى ﷺ يقول لا يدخل هذا بيت قوم الا ادخله الله الذل.

ترجمہ: ابو امامہ باہلی ؓ نے ہل کا ایک پھل اور کچھ آلات کھیتی کے دیکھے تو انہوں نے کہا کہ میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جس قوم کے گھر میں یہ چیزیں داخل ہو جاتی ہیں تو اللہ اس میں ذلت کو داخل کر دیتا ہے۔

وضاحت: روایت کے الفاظ کے مطابق ابو امامہ باہلی نے ہل اور کھیتی باڑی کا کچھ سامان دیکھا تو یہ حدیث بیان کی کہ جو قوم ان چیزوں کو گھروں میں داخل کر لیتی ہے تو وہ ان میں ذلت کو داخل کرتی ہے۔ یہ الفاظ بالکل واضح ہیں، ان میں کسی طرح کا اشتباہ نہیں رہنے دیا گیا جس کی وجہ سے مفہوم بدلنے کی کوئی گنجائش نکالنا ممکن نہیں۔ امام صاحب اس روایت کو جس باب میں لائے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کھیتی باڑی اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں حد سے بڑھی ہوئی مشغولیت مناسب نہیں۔ اس کے مفاسد سے بچنا چاہیے۔ باب کی یہ بات روایت کے الفاظ سے بالکل نہیں نکلتی۔

جہاں تک حد سے بڑھی ہوئی مشغولیت کا تعلق ہے تو وہ کھیتی باڑی ہی پر منحصر نہیں ہے۔ جس چیز میں بھی آپ اتنے منہمک ہو جائیں کہ حدود سے تجاوز کر جائیں تو وہ آپ کے لیے فتنہ بن جائے گی۔ حتیٰ کہ تجارت اور نماز روزہ میں حد سے بڑھا ہوا اشتغال بھی فتنہ بن سکتا ہے۔ آخر رہبانیت میں کیا غلطی تھی؟ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی تعریف کی، لیکن غلطی یہ ہوئی کہ اس میں حدود سے تجاوز ہو گیا اور اسلام میں اس سے

روک دیا گیا۔

اب الفاظ حدیث پر غور کیجئے۔ کیا واقعی کھیتی باڑی گھروں میں ذلت لاتی ہے۔ قریش کا پیشہ تجارت اور گلہ بانی تھا جبکہ مدینہ کے انصار کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔ لیکن یہ انصار ہی تھے جنہوں نے مہاجرین کو تحفظ فراہم کیا۔ وہ اپنے شہر کے معزز لوگوں میں تھے جن کے معاہدات دوسرے قبائل حتیٰ کہ یہودی قبائل کے ساتھ بھی تھے۔ ذلت نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نہیں پائی گئی۔ اس سے انکار نہیں کہ ہر پیشے کے لوگوں میں کچھ خصوصیات ہوتی ہیں لیکن بہر حال وہ انسانیت کے دائرہ میں اسی کا ایک پہلو ہوتی ہیں۔ تمدن اور معاشرت کے قیام و بقا کے لیے جتنے پیشے ہیں ان میں سے کوئی پیشہ بھی ذلیل نہیں ہے اور کھیتی باڑی بھی معاشی زندگی کے ذرائع میں ایک اہم ذریعہ ہے۔ ہر پیشہ اپنی جگہ بمنزلہ ایک رکن کے ہے۔ یہ تو ہم اور آپ اپنی تنگ ظرفی کی وجہ سے نائی، دھوبی، لوہار وغیرہ کو نہ جانے کیا کیا بنا کر ہر ایک کے ساتھ کچھ چپکاتے جاتے ہیں تا کہ ان کا مذاق اڑائیں۔ نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں بھی کسی قوم پر اس کے معاشی ذرائع کا، اس کے کاروبار کا، ایک خاص اثر ضرور پڑتا ہے لیکن یہ سب انسانی دائرہ کے اندر ہوگا۔ اس میں سے کسی کو آپ حقیر و ذلیل نہیں گردان سکتے۔ یہ سب پیشے معاشرہ کے لیے ضروری ہیں اور یکساں عزت کے مستحق ہیں۔ ان میں تفاوت ہوگا تو دوسرے پہلو سے ہوگا کہ کس کی افادیت کتنی ہے۔

میرے خیال میں ابو امامہ نے جو روایت کی ہے اس کی اصل جاہلیت سے چلی آ رہی تھی۔ اس زمانہ کے اقوال موجود تھے۔ جب لوگوں نے موقع پایا تو ان کو روایت میں گھسا دیا۔ آنحضرت ﷺ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں جب کہ آپ ہر قسم کی محنت کے قدردان تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام کے ابتدائی نظام کی ریڑھ کی ہڈی انصار ہیں اور ان کی تمام معاش و معیشت کا انحصار کھیتی باڑی پر تھا۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھیے کہ یہ روایت پچھلی روایت کے منافی بھی ہے۔ سابق روایت میں تو یہ ہے کہ کھیتی باڑی میں بڑی فضیلت ہے اور یہ بات انسانی تقاضوں اور اسلام کے مزاج کے مطابق ہے۔ امام صاحب کی مجبوری یہ ہے کہ یہ روایت راویوں کے اعتبار سے ان کے معیار پر پوری اتر گئی تو اس کو انہوں نے قبول کر لیا۔ پھر باب کا عنوان قائم کرنے میں تکلف سے کام لیا۔ البتہ ان دونوں روایتوں میں سے ہم ایک کو قبول کر سکتے ہیں اور پہلی روایت ہی کو قبول کرنا مناسب ہے۔

باب: اقْتِنَاءُ الْكَلْبِ لِلْحَرْثِ

باب: کھیت کی حفاظت کے لیے کتا رکھنا

حدثنا معاذ بن فضالة حدثنا هشام عن يحيىٰ بن ابى كثير عن ابى سلمة عن

ابى هريرةؓ قال قال رسول الله ﷺ مَن اَمْسَكَ كَلبًا فَاِنَّهُ يَنْقُصُ كُلَّ يَوم من عمله قيراط اِلَّا كَلبَ حَرْثٍ اَو مَاشِيَة و قال ابن سيرين اور ابو صالح عن ابى هريرة عن النبى ﷺ اِلَّا كَلبَ غَنم او حَرْثٍ اَو صَيدٍ وقال ابو حازم عن ابى هريرةؓ عن النبى ﷺ كَلبُ صَيدٍ اَو مَاشِية.

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی کتا رکھا تو وہ اس کے عمل میں سے ہر روز بقدر ایک قیراط کے کمی کر دے گا بجز اس کے کہ وہ کتا کھیتی یا مویشیوں کی حفاظت کے لیے ہو۔ ابن سیرین کے الفاظ یہ ہیں کہ بجز اس کے کہ وہ کتا جو بکریوں یا کھیتی یا شکار کے لیے ہو۔ اور ابو حازم کی روایت میں شکار یا ریوڑ کا کتا مستثنیٰ ہے۔

حدثنا عبدالله بن يوسف اخبرنا مالك عن يزيد بن خصيفة ان السائب بن يزيد حدثه انه سمع سفيان بن ابى زهير رجلا من ازد شنوءة و كان من اصحاب النبى ﷺ قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من اقتنا كلبا لا يغنى عنه زرعا ولا ضرعا نَقص كلَّ يوم من عمله قيراط قُلتُ انتَ سَمِعتَ هذا من رسول الله ﷺ قال إى و ربِّ هذا المسجد.

ترجمہ: سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے ازد شنوءہ قبیلہ کے سفیان بن ابی زہیر سے سنا جو آنحضرت ﷺ کے صحابی تھے۔ وہ بیان کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس نے کتا رکھا اور وہ نہ اس کی کھیتی کے لیے ضروری ہے اور نہ اس کے مویشی کے لیے، تو ہر روز ایک قیراط کے بقدر اس کے عمل میں سے کمی ہو جائے گی۔ سائب کہتے ہیں کہ میں نے سفیان سے پوچھا کیا تم نے خود یہ آنحضرت ﷺ سے سنا، انہوں نے کہا ہاں اس مسجد کے رب کی قسم۔

وضاحت: ایک قیراط سے کیا مراد ہے، صحیح طور پر نہیں بتایا جا سکتا۔ بس ایک تصور دیا گیا ہے کہ اتنے کی کمی ہو جائے گی اور عمل سے مراد ظاہر ہے کہ نیک عمل ہے۔ کھیتی، ریوڑ کی حفاظت اور شکار کے مقصد سے پالے ہوئے کتے مستثنیٰ ہیں۔ کھیتی باڑی اور شکار وغیرہ کے لیے کتا رکھنا تو قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اب تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ کتے کی افادیت، ضرورت اور اہمیت پہلے سے بڑھ گئی ہے اور دائرہ بھی وسیع ہو گیا ہے۔ فوج میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ کسٹم والے خاص ضرورت کے تحت اس کو رکھتے ہیں۔ اس کے بغیر تفتیش ادھوری رہ جاتی ہے۔

روایت کا کوئی محل ہو سکتا ہے تو میرے نزدیک یہ ہے کہ شوقیہ اور فیشن کے لیے جو کتے پالے جاتے ہیں جو بالعموم میم صاحبہ اور صاحب لوگوں کی بغل میں رہتے ہیں، روایت میں وہ مراد ہیں۔ ان میں یقیناً ٹیک عمل کم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایک کتا ہے، میں پوچھتا ہوں یہ کا ہے کو رکھ چھوڑا ہے، دونوں وقت گوشت کھاتا ہے، سیر کرانے کے لیے آدمی کی ضرورت ہے تو جواب ملتا ہے کہ بھونکتا ہے۔ میں نے کہا یہ ایسا کیا کام ہے جس کے لیے اتنا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو آج کل کتے کا بھونکنا بھی ایک ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ملک میں پابندیوں کی جو صورت حال ہے اس میں غنیمت ہے کہ کتے کو بھونکنے کا موقع مل جائے۔

باب: استعمال البقر للحراثة

باب: کھیتی کے لیے گائے بیل سے کام لینا

حدثنا محمد بن بشار حدثنا غندر حدثنا شعبة عن سعد بن ابراهيم قال سمعت ابا سلمة عن ابی هريرةؓ عن النبی ﷺ قَالَ بَيْنَمَا رَجل" رَاكِب" عَلٰی بَقَرةٍ التفتت إليه فقالت لم أُخلَق لِهٰذا خُلِقتُ للحراثة قَالَ آمنتُ بِهِ اَنَا وَ ابُوبكرؓ و عمرؓ و اخذ الذِّئبُ شَاةً فتبعها الرَّاعی فقَالَ من لَهَا يَومَ السَّبُعِ يوم لا رَاعی لَهَا غيری قَالَ آمنتُ به انا و ابوبكرؓ و عمرؓ قال ابو سلمة و ما هما يومئذ فی القوم.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص بیل پر سوار جا رہا تھا کہ بیل نے شخص کی طرف متوجہ ہو کر کہا میں اس لیے پیدا نہیں ہوا، میں تو کھیتی کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ آپ نے کہا میں اس پر ایمان لایا اور ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی۔ اور اسی سلسلے میں یہ بات بھی تھی کہ بھیڑیے نے ایک بکری کو پکڑ لیا تو چرواہے نے اس کا پیچھا کیا تو بھیڑیے نے چرواہے سے کہا (آج تو تم میرے پیچھے پڑ گئے لیکن) درندوں کی حکمرانی کے دن اس کو کون بچائے گا جس دن اس کا چرواہا میرے سوا کوئی نہ ہوگا۔ اس پر بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا میں اس پر ایمان لایا اور ابو بکرؓ و عمرؓ بھی۔ ابو سلمہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں حضراتؓ اس دن مجلس میں موجود نہ تھے۔

وضاحت: اس روایت میں مشکلات کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے زور دے کر فرمایا کہ میں اس پر ایمان لایا اور ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بے موقع نہیں کہی جائے گی، اس موقع پر کہی جائے گی جب کہ اندیشہ ہو کہ لوگ اس کا انکار کریں گے یا واقعۂ انکار موجود ہو کہ بیل کا بولنا کیا ہے اور بھیڑیے کا کلام کرنا کیسے ممکن ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا ہو کہ دوسرے لوگ مانیں یا نہ مانیں، میں، ابو بکر اور عمر اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب روایت بیان کی گئی تو اس پر اسی طرح کا

ردعمل ہوا۔ روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موقع و محل کا لحاظ اور اس کی تفصیلات حذف کر دی گئی ہیں جس کی وجہ سے روایت میں الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ خود حضرت ابو ہریرہؓ نے ہی خلاصہ بیان کر دیا ہے اور موقع و محل وغیرہ کو چھوڑ دیا ہے۔

روایت پڑھ کر مجھے خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے بطور بیان واقعہ کے بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک قصہ بیان کیا ہوگا۔ بنی اسرائیل کے ہاں اس طریقہ کی روایات ہیں۔ اس کے بعد میں نے شرح بھی میں دیکھا تو پہلا قول اس معاملہ میں جو نقل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت بنی اسرائیل کے سیاق و سباق کی ہے اور ان ہی سے متعلق ہے اور امام بخاری نے ایسا ہی سمجھا ہے۔ اس سے محسوس ہوا کہ میرا قیاس اٹکل پچ نہیں تھا۔ اگر یہ اس سلسلے کی بات ہے تو آنحضرت ﷺ نے وضاحت فرمائی ہوگی کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ ہے۔

وہ بات جو بیل یا بھیڑیے کی طرف منسوب ہوئی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ لازماً زبان قال سے ہو بلکہ زبان حال سے بھی ہو سکتی ہے۔ زبان حال سے بہت ساری باتیں ہوتی ہیں۔ ایک بھینس زبان حال سے پکارتی ہے کہ میں سواری کے لیے نہیں، یہ بات سمجھانے کے لیے اس کو تقریر کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح ایک گھوڑا زبان حال سے پکارتا ہے کہ میں سواری کے لیے ہوں۔ یہ بات حضور ﷺ نے کسی ایسے موقع پر فرمائی ہوگی جب لوگوں نے چیزوں سے بے محل کام لیا ہوگا اور ان کو صحیح مصرف میں نہیں لائے ہوں گے۔ اس پر حضور ﷺ نے یہ قصہ بیان کیا ہوگا۔

اس روایت میں ایک بات اور بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے کسی راوی کو یہ بات کھٹکی ہے کہ لوگ اس کو عجوبہ بنائیں گے تو اس کو دور کرنے کے لیے اس ٹکڑے کا اس میں اضافہ کر دیا کہ میں ایمان لایا اور ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی، چاہے کوئی نہ مانے۔ میرے نزدیک یہ ٹکڑا اس طرح روایت میں داخل ہوا ہے۔ تمام ذخیرۂ احادیث میں اور کہیں نہیں ملتا کہ آنحضرت ﷺ نے اس اختصاص کے ساتھ یہ بات فرمائی ہو جب کہ وہ دونوں حضرات صحابہؓ وہاں موجود بھی نہ ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ اختصاص حضرات شیخینؓ کو حاصل ہے لیکن یہاں اس کے اظہار کا محل سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کسی مجلس میں یہی دو حضراتؓ آنحضرت ﷺ کا ساتھ دیں۔ باقی حضرات حیرت کا اظہار کرتے رہ جائیں۔ اس زمانہ میں کس کی مجال تھی کہ حضور کی بات نہ مانتا۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مخاطبوں نے تو بات کو خوب سمجھ لیا ہو لیکن راوی نے بات نہیں سمجھی اور ایسے طریقہ سے نقل کر دی جس سے سوالات پیدا ہو گئے۔ اس نہج پر اس روایت کا اشکال اگر حل ہو جاتا ہے تو فبہا۔ هذا ما عندی والعلم عند الله.

درس موطا امام مالکؒ

(کتاب الطہارۃ کی روایات)

(۴) باب: مالا یجب منه الوضوء

باب: وہ چیزیں جن سے وضو لازم نہیں ہوتا

۱۔ حَدَّثَنِی یَحْیٰی عَنْ مَالِکٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عُمَارَةَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِیْمَ عَنْ اُمِّ وَلَدٍ لِاِبْرَاهِیْمَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّهَا سَاَلَتْ اُمَّ سَلَمَةَ. زَوْجَ النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَتْ: اِنِّی امْرَاَةٌ" اُطِیْلُ ذَیْلِیْ وَ اَمْشِیْ فِی الْمَكَانِ الْقَذِرِ. قَالَتْ اُمُّ سَلَمَةَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: یُطَهِّرُهٗ' مَا بَعْدَهٗ'.

ترجمہ: ابراہیم بن عبدالرحمان بن عوف کی ام ولد نے نبی ﷺ کی زوجہ مطہرہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ میں ایسی عورت ہوں کہ میرے پیراہن کا دامن لمبا رہتا ہے اور میں گندی جگہوں پر سے گزر جاتی ہوں۔ تو حضرت ام سلمہؓ نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے بعد جو جگہ صاف آتی ہے تو وہ اس کو پاک کر دیتی ہے۔

وضاحت: ذَیـــل": یعنی کرتے قمیص، پیراہن یا جامے کا دامن۔ عورتیں لمبی قمیص پہنتی تھیں اور تکمیل حجاب کے خیال سے دامن کو اتنا گرا دیتی تھیں کہ بسا اوقات زمین کو چھونے لگتا۔

المکان القذر: مطلب ہے مشتبہ جگہ جہاں گندگی لگنے کا خطرہ ہو۔

راویہ کا کہنا یہ ہے کہ ان کا گزر پاکیزگی کے نقطۂ نظر سے ایسی راہوں اور جگہوں سے بھی ہو جاتا ہے جو بادی النظر میں مشتبہ ہوتی ہیں اس لیے کہ ان کے لباس کا دامن معمولاً لمبا ہوتا ہے اور گھسٹتا بھی ہے۔ تو حضرت ام سلمہؓ نے جواب دیا کہ اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ گندی جگہ کے بعد پاک جگہ بھی آتی ہے جو اس کو صاف کر دیتی ہے۔ اسی لیے فقہاء نے ایک الگ اصول بنا دیا کہ بعض چیزوں کی طہارت صرف کھرچ کر رگڑ دینے سے ہو جاتی ہے۔ یعنی ان کی طہارت کے لیے دھونا نہیں بلکہ رگڑ دینا یا ان کا رگڑا جانا کافی ہے۔ مثلاً ایک زمانے میں مخصوص حالات میں۔ رفع زحمت کے خیال سے۔ جوتا پہن کر نماز پڑھنے کا رواج رہا ہے۔ اس حالت میں آپ دیکھتے

ہیں کہ جوتے میں معمولی نجاست لگی ہوئی ہے تو اس کو کہیں رگڑ دیں اس سے جوتا صاف ہو جائے گا۔ اس کو دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلتے ہوئے جوتے کی طہارت خودکار طریقے سے خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ جوتا پہن کر نماز پڑھنا کنکریوں والی زمین میں تو مجبوری رہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسی عظیم ہستی کا یہ عمل نقل ہوا ہے۔

۲۔ وَ حَدَّثَنِیْ عَنْ مَالِکٍ اَنَّهٗ رَاٰ رَبِیْعَةَ بْنَ عَبْدِالرَّحْمٰنِ یَقْلِسُ مِرَارًا وَهُوَ فِی الْمَسْجِدِ فَلَا یَنْصَرِفُ وَلَا یَتَوَضَّاُ حَتّٰی یُصَلِّیْ.

ترجمہ: امام مالکؒ سے روایت ہے کہ میں نے ربیعہ بن عبدالرحمٰن کو متعدد بار دیکھا کہ اپنے حلق سے قے کی شکل میں کوئی چیز نکالتے ہیں اور وہ مسجد میں ہی ہیں۔ وہ نہ باہر نکلے اور نہ انہوں نے وضو کیا یہاں تک کہ اسی حالت میں نماز پڑھتے رہے۔

وضاحت: قَلَس": یعنی حلق سے قے کی شکل میں کوئی پانی اور غذائی مواد وغیرہ کا نکل آنا۔ یہاں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ پانی اور غذائی اجزا وغیرہ حلق سے قے کی شکل میں خارج ہو جائیں تو اعادہ وضو لازم نہیں آتا ہے۔ چونکہ یہ ناقض وضو چیز نہیں ہے اس لیے صرف کلی کر لینا کافی ہے اگرچہ یہ بھی ضروری نہیں ہے، جیسا کہ ربیعہ بن عبدالرحمٰن کے عمل سے ظاہر ہے۔

۳۔ وَ حَدَّثَنِیْ عَنْ مَالِکٍ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ حَنَّطَ ابْنًا لِسَعِیْدِ بْنِ زَیْدٍ وَ حَمَلَهٗ' ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَصَلّٰی وَلَمْ یَتَوَضَّاْ.

ترجمہ: نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سعید بن زید کے بیٹے کی میت کو حنوط کیا اور اس کو اٹھایا۔ پھر مسجد میں داخل ہوئے، نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

وضاحت: حَنَّطَ: میت کو حنوط کیا۔ یعنی خوشبو وغیرہ لگائی۔

حَمَلَهٗ': یعنی جنازے وغیرہ کی شکل میں لے جانے کے لیے اٹھایا۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے امور انجام دینے سے بھی وضو نہیں لازم ہوگا۔

امام مالک کے فتوے:

۱۔ یحیٰی کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص (پانی کے علاوہ) کھانا بھی قے کی شکل میں خارج کرے تو کیا اس کے اوپر وضو فرض ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وضو تو نہیں ہے البتہ یہ ہے کہ وہ اس کے باعث کلی کرے اور اپنا منہ دھو لے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر مجرد پانی کی شکل کی کوئی چیز حلق سے نکلی ہے تب تو کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر غذا کی شکل میں کچھ خارج ہوا ہے اور ایسا بسا اوقات ہو جاتا ہے تو اس صورت میں امام مالک کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ کلی بھی کرے اور اپنا منہ بھی دھو لے۔ البتہ محض پانی کے اخراج کی شکل میں اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے قے کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کے لیے وضو ضروری ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں! بلکہ وہ اس کے باعث کلی کر لے اور اپنے منہ کو دھو لے۔ یہ چیز ناقض وضو نہیں ہے۔

یعنی طبیعت میں نشاط کی خاطر اور منہ کا ذائقہ درست کرنے کے لیے بس اتنی احتیاط کرلے کہ کلی کر لے اور اپنا منہ دھو لے۔ ان کے فتوے کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اگر کچھ غذائی اجزاء بھی خارج ہوئے ہیں تو ایسا کرنا صفائی کے نصب العین کے عین موافق ہوگا، جو خوش ذوقی بھی ہے۔

(۵) باب: ترک الوضوء مما مسته النار

باب: آگ پر تیار ہوئی چیز کے کھانے سے وضو کی رخصت

۱۔ حَدَّثَنِي يَحْيٰى عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ اَكَلَ كَتِفَ شَاةٍ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھنا ہوا بکری کا اگلا دست کھایا، پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

وضاحت: اس باب کا اصولی مضمون یہ ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اس کی تجدید کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

مالکیہ اس موقف کے سخت حامی ہیں اور اس کے مخالفین کے سخت خلاف ہیں اسی لیے امام مالکؒ نے اس باب میں اس مضمون کی ساری حدیثیں جمع کر دی ہیں کہ یہی مسئلہ درست ہے۔

۲۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ بُشَيْرِ بْنِ يَسَارٍ. مَوْلَى بَنِي حَارِثَةَ. عَنْ سُوَيْدِ بْنِ النُّعْمَانِ اَنَّهُ اَخْبَرَهُ اَنَّهُ خَرَجَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ عَامَ خَيْبَرَ حَتّٰى اِذَا كَانُوا بِالصَّهْبَاءِ. وَهِيَ مِنْ اَدْنٰى خَيْبَرَ. نَزَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَصَلَّى الْعَصْرَ. ثُمَّ دَعَا بِالْاَزْوَادِ فَلَمْ يُؤْتَ اِلَّا بِالسَّوِيقِ فَاَمَرَ بِهِ فَثُرِّيَ. فَاَكَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَ اَكَلْنَا. ثُمَّ قَامَ اِلَى الْمَغْرِبِ فَمَضْمَضَ وَ مَضْمَضْنَا. ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: حضرت سوید بن نعمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ واقعہ خیبر کے سال نکلے یہاں تک کہ جب صہباء میں پہنچے۔ اور وہ خیبر کے قریب ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ سواری سے اترے اور عصر کی نماز پڑھی۔ پھر آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ توشہ لایا جائے۔ صرف ستو لائے گئے۔ آپ نے حکم دیا تو وہ گھولے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کو نوش فرمایا اور ہم نے بھی کھایا۔ پھر آپ نماز مغرب کے لیے اٹھے تو آپ ﷺ نے بھی کلی کر لی اور ہم نے بھی کلی کر لی۔ پھر آپؐ نے نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

وضاحت: دَعَا بِالْاَزْوَادِ: یعنی فرمایا کہ جس کسی کے پاس جو کچھ بھی ہو وہ لے آئے۔

اَلسَّوِيقُ: ستو۔ اور وہ بھی جَو کے۔ سبحان اللہ! یہ غور کر لیجیے گا کہ یہ ہے مجاہدین صدر اول کا زاد راہ!

فَثُرِّيَ: یعنی وہ گھولا گیا یا گوندھا گیا۔

ستو کھایا یا پیا جائے تو اس کے ذرات منہ میں رہ جاتے ہیں۔ صفائی کے نقطہ نظر سے اتنا کافی ہوتا ہے کہ کلی کر لی جائے اور سابق وضو پر نماز ادا کر لی جائے۔

پکا ہوا گوشت یا کوئی اور سالن کھانے کی صورت میں وہ کچھ نہ کچھ ہاتھوں میں بھی لگا رہ جاتا ہے اور منہ میں بھی اس کا ذائقہ باقی رہ جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد قرینے سے ہاتھ منہ دھونے کی ہدایت فرمائی۔ وضو کا لفظ مجرد دھونے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس کو اصطلاحی معنی میں وضو نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر مقصد حقیقی وضو کرنا ہوتا تو حضور کا اپنا عمل اور آپ کے صحابہ کا عمل اس کے خلاف نہ ہوتا۔

۳۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ الْمُنْكَدِرِ وَ عَنْ صَفْوَانَ سُلَيْمٍ اَنَّهُمَا اَخْبَرَاهُ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيمَ بْنِ الْحَارِثِ التَّيْمِيِّ عَنْ رَبِيعَةَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الْهُدَيْرِ اَنَّهُ تَعَشّٰى مَعَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: حضرت ربیعہ بن عبداللہ بن ہدیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

۴۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ ضَمْرَةَ بْنِ سَعِيدٍ الْمَازِنِيِّ عَنْ اَبَانَ بْنِ عُثْمَانَ اَنَّ عُثْمَانَ ابْنَ عَفَّانَ اَكَلَ خُبْزًا وَ لَحْمًا ثُمَّ مَضْمَضَ وَ غَسَلَ يَدَيْهِ وَ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: ابان بن عثمان سے روایت ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے روٹی اور گوشت کھایا، پھر کلی کی اور اپنے دونوں ہاتھ دھوئے اور ان سے اپنا چہرہ پونچھ لیا۔ پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

۵۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِي طَالِبٍ وَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَبَّاسٍ كَانَا لَا يَتَوَضَّآنِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ.

ترجمہ: امام مالکؒ سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرات علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آگ پر پکی چیز کے کھانے پر وضو نہیں کرتے تھے۔

وضاحت: موطا امام مالک میں حضرات علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی فقاہت کا تذکرہ بہت کم ہوا ہے۔ اس پہلو سے یہ روایت شاذ ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اس باب میں امام مالک ان کو بھی لائے ہیں۔

۶۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ اَنَّهُ سَاَلَ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَامِرِ بْنِ رَبِيعَةَ عَنِ الرَّجُلِ يَتَوَضَّأُ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ يُصِيبُ طَعَامًا قَدْ مَسَّتْهُ النَّارُ اَيَتَوَضَّأُ؟ قَالَ: رَاَيْتُ اَبِي يَفْعَلُ ذَالِكَ وَلَا يَتَوَضَّأُ.

ترجمہ: یحیٰی بن سعید سے روایت ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے ایک ایسے شخص کے باب میں فتویٰ پوچھا جس نے نماز کے لیے وضو کیا، پھر آگ پر پکی ہوئی کھانے کی کوئی چیز آ گئی تو کیا یہ (اس کے کھانے کے بعد) دوبارہ وضو کرے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنے والد ماجد کو دیکھا کہ وہ ایسا کرتے تھے اور وضو نہیں کرتے تھے۔

۷۔ وَ حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِي نُعَيْمٍ وَهْبِ بْنِ كَيْسَانَ اَنَّهُ سَمِعَ جَابِرًا ابْنَ عَبْدِاللّٰهِ الْاَنْصَارِيَّ يَقُولُ: رَاَيْتُ اَبَا بَكْرٍ الصِّدِّيقَ اَكَلَ لَحْمًا ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے گوشت کھایا، پھر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

۸۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ دُعِيَ لِطَعَامٍ فَقُرِّبَ اِلَيْهِ خُبْزٌ" وَ لَحْمٌ" فَاَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ تَوَضَّأَ وَ صَلّٰى. ثُمَّ اُتِيَ بِفَضْلِ ذَالِكَ الطَّعَامِ فَاَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ صَلّٰى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ.

ترجمہ: محمد بن منکدرؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی نے کھانے کی دعوت دی۔ آپ کی خدمت میں روٹی اور گوشت پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے کھایا پھر آپؐ نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر اس کے بعد بقیہ کھانا لایا گیا تو آپ نے اس میں سے بھی کھایا پھر آپؐ نے نماز پڑھی اور دوبارہ وضو نہیں کیا۔

وضاحت: معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلا وضو اس لیے کیا کہ آپ وضو سے نہیں تھے۔ اور کھانے کے بعد دوبارہ اس لیے نہیں کیا کہ اس کی حاجت نہیں تھی۔

۹۔ وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ عَنْ عَبْدِالرَّحْمَانِ بْنِ يَزِيدَ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَدِمَ مِنَ الْعِرَاقِ فَدَخَلَ عَلَيْهِ اَبُو طَلْحَةَ وَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَقَرَّبَ لَهُمَا طَعَامًا قَدْ مَسَّتْهُ النَّارُ فَاَكَلُوا مِنْهُ. فَقَامَ اَنَسٌ" فَتَوَضَّأَ. فَقَالَ اَبُو طَلْحَةَ وَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ. مَا هٰذَا يَا اَنَسُ؟ اَعِرَاقِيَّةٌ؟ فَقَالَ اَنَسٌ: لَيْتَنِي . لَمْ . اَفْعَلْ وَ قَامَ اَبُو طَلْحَةَ وَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ فَصَلَّيَا وَلَمْ يَتَوَضَّآ!

ترجمہ: حضرت عبدالرحمن بن یزید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب انس بن مالکؓ عراق سے آئے تو ان سے ملنے کے لیے ابوطلحہؓ اور ابی بن کعب آئے۔ انہوں نے ان دونوں حضرات کے سامنے آگ پر پکا ہوا کھانا پیش کیا۔ اس میں سے سب نے کھایا۔ پھر انسؓ اٹھے اور انہوں نے وضو کیا۔ اس پر ابوطلحہؓ اور ابی بن کعبؓ دونوں نے کہا: اے انس! یہ عراقیت آپ کہاں سے لائے ہو؟ تو انسؓ نے کہا کہ کاش! میں نے ایسا نہ کیا ہوتا! اور ابوطلحہؓ اور ابی بن کعب دونوں حضرات اٹھے اور انہوں نے نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔

وضاحت: مَا هٰذَا يَا اَنَسُ؟ اَعِرَاقِيَّةٌ؟ یعنی اے انس! یہ عراقیت آپ کہاں سے لائے ہو؟۔ گویا ان کے نزدیک یہ خاص مذہب عراقیوں کا تھا اور یہ دونوں حضرات اس کے شدید مخالف تھے۔

لَيْتَنِي لَمْ اَفْعَلْ! کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا! یعنی حضرت انسؓ نے اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔

روایت کی تفصیلات سے معلوم ہو گیا کہ مسئلے کی اصل نوعیت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہو گا کہ جو شخص آگ پر پکی ہوئی چیز کھائے تو وہ اپنے ہاتھ منہ کھانے سے دھولیا کرے۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ اس مسئلے میں لفظ 'وضو' نے مغالطہ پیدا کر دیا۔ لغت میں 'وضو' کے اصلی معنی دھونے کے ہیں۔ وضو کے اصطلاحی معنی الگ ہیں۔ معنی کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے غلط فہمی پیدا ہو گئی اور اس پر مبنی ایک الگ مذہب بن گیا۔ ہمارے نزدیک یہ ہے اصل واقعہ! یہ بات نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے کوئی حکم دیا تھا پھر وہ منسوخ ہو گیا، جیسا کہ بعض لوگوں کے ہاں سمجھا جاتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی ایسی صورت پیش آئی ہے منسوخ اور ناسخ دونوں محفوظ ہوتے ہیں۔

اس روایت کے نقل کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ جیسا شخص بھی چوٹ کرنے سے باز نہیں آیا اور باب کے آخر میں یہ راز کھل گیا کہ اس مسئلے میں انہوں نے جتنی داستان بھی بڑھائی وہ صرف عراقیت پر چوٹ کرنے کے لیے کہ یہ روایت ان کی تردید میں ہے۔

(۵) باب جامع الوضوء

باب: مسائل وضو میں جامع بات

۱۔ حدثنی یحیی عن مالک عن ہشام بن عروۃ عن ابیہ ان رسول اللہ ﷺ سئل عن الاستطابۃ فقال: اولا یجد احدکم ثلاثۃ احجار؟

ترجمہ: ہشام بن عروہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عمدہ طریقے سے پاکی حاصل کرنے سے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو تین پتھر نہیں ملتے؟

وضاحت: جامع الوضوء: مسائل وضو میں جامع بات۔

جہاں تک آسانی سے ممکن ہوتا ہے تو امام مالکؒ (بشمول راویانِ موطا) الگ الگ باب قائم کرتے ہیں۔ لیکن جو روایات ایک باب کے تحت نہیں آتیں تو میں نے دیکھا ہے کہ ان کو جامع الوضوء یا جامع الصلوۃ یا جامع الصوم وغیرہ کے تحت ایک الگ باب قائم کر کے مجموعے کی صورت میں نقل کر دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الگ الگ تبویب آسان کام تو ہے نہیں اور یہ بیشتر متاخرین کا کیا ہوا ہے۔

الاستطابۃ: پاکی حاصل کرنا۔ صحابہؓ کا سوال یہ تھا کہ استنجا وغیرہ کے بعد پاکی حاصل کرنے کا عمدہ اور معیاری طریقہ کیا ہے۔

نبی ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پاکیزگی کے حصول کے لیے اگر تین پتھر میسر آ جائیں تو یہ کفایت کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ ڈھیلے اور کنکر بھی اس میں شامل ہیں۔ طہارت کے لیے یہ عام اور آسان نسخہ ہے۔ یعنی اگر کوئی آدمی حضر میں ہو، سفر میں ہو، کہیں کام پر ہو یا کسی بھی جگہ ہو تو اس مقصد کے لیے تین پتھر یا اس قبیل کی چیزیں جیسے کپڑا یا ٹائلٹ پیپر، جو اسی حکم میں داخل ہیں، کام دے سکتی ہیں بشرطیکہ وہ رطوبات فاسدہ کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ عربوں کے پتھروں سے ہمارے ہاں کے ڈھیلے رطوبات فاسدہ کو جذب کرنے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ تین کا عدد بالعموم تکمیلی عدد ہے۔ اگر ضرورت متقضی ہو تو اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور کم میں طہارت حاصل ہو جانے کے بعد تین کا اہتمام مستحسن ہے۔

(ترتیب: ماجد خاور)

خالد مسعود

نظام نبوت و رسالت

علم وحی انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک خصوصی عطا ہے جس کے ذریعہ سے اس نے انسان کی ہدایت کا ایک بے خطا نظام قائم کیا ہے۔ وحی کے اصل معنی دل میں بات ڈالنے اور اشارہ سے پیغام دینے کے ہیں۔ لیکن اس کے لیے یہ شکل اختیار نہیں کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کے ہر فرد کو بلا واسطہ کوئی ہدایات دی ہوں۔ ذات کبریا سے ہم کلام ہونے میں حقیقی مانع انسان کا اپنا ضعف، ناتوانی اور نااہلیت ہے۔ اس کے انوار و تجلیات ایسے ہیں کہ انسان اس سے رودررو ہونے کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہود کی تاریخ میں بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے خواہش ظاہر کی کہ اللہ تعالیٰ خود ان سے ہم کلام ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی تجلی نمودار ہوئی، پہاڑ پر لرزہ طاری ہو گیا اور بنی اسرائیل کی جماعت بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

مخلوقات میں صرف ملائکہ یعنی فرشتوں کو، جو نورانی مخلوق ہیں، یہ خصوصیت عطا ہوئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی سے احکام و ہدایات لیتے اور ان کو نافذ کرتے ہیں۔ اگر مزید رہنمائی کی ضرورت ہو تو وہ معاملات کو اسی بارگاہ میں پیش کر کے نئے احکام لیتے ہیں۔ مخلوق ہونے کے باعث فرشتوں کا تعلق دوسری مخلوقات کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ انسان چونکہ مادی وجود رکھنے کے ساتھ ساتھ روح کا بھی حامل ہے اس لیے فرشتوں کا اس کے ساتھ روحانی اتصال ممکن ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی ہدایت پہنچانے کا ذریعہ فرشتوں کو بنایا اور ان کے ساتھ روحانی اتصال کے لیے ایسے انسانوں کو چنا جو روحانی اعتبار سے مضبوط، اپنی نیک فطرت کی آواز پر لبیک کہنے والے اور اپنی عقل کو خیر و شر میں امتیاز کے لیے استعمال کرنے والے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو محض اپنے وجدان کی روشنی میں خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے والے اور اپنے اعلیٰ کردار، صداقت و امانت، عفت و پاکیزگی، نیکی و خدا ترسی کے باعث معاشرہ کے دیگر افراد سے ممتاز، برتر، معزز و محترم تھے۔ اللہ تعالیٰ وحی کے طریقہ سے جو پیغام انسانوں کے لیے بھیجنا چاہتا وہ کسی فرشتہ کے حوالے کرتا جو انہی پاکباز انسانوں کے ایک معین فرد کے ساتھ روحانی اتصال کے ذریعے اس کو پہنچا دیتا اور وہ فرد اس کو اپنی ذمہ داری اور فریضہ سمجھ کر ابنائے زمانہ تک پہنچا دیتا۔ جن معین افراد کو اس مقصد کے لیے چنا گیا وہ اللہ کے نبی کہلائے۔ اپنے اپنے دور میں انہوں نے انسانوں کی تعلیم و تربیت میں اپنی عمریں کھپا دیں۔

وحی کی کیفیت و ماہیت کیا ہے؟ اس کو سمجھنا کسی کے بس میں نہیں۔ یہ خدائی امور میں سے ہے۔ اس کی کیفیت وہی جانتا ہے جو اس کو نازل کرتا ہے یا پھر وہ نبی جانتا ہے جس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ وحی کا طریقہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہا۔ ہدایت کی اہمیت و نوعیت کے لحاظ سے اس کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے گئے، جو وحی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس کی ادنیٰ شکل یہ ہے کہ انبیاء کو خواب میں اللہ کے حکم سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ یہ خواب سپیدۂ صبح کی طرح بالکل واضح اور روشن ہوتے ہیں اور نبی کے قلب پر انمٹ اثر چھوڑتے ہیں۔ عالم غیب کے وسیع الاطراف حقائق اور آئندہ پیش آنے والے واقعات نبی کو مکاشفہ کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ انبیاء کو بعض اوقات جاگتے میں بھی ہدایات ملتی ہیں اور وہ ہاتف غیبی کی آواز سنتے ہیں۔ وحی کی اعلیٰ شکل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پیغمبر کے دل پر اپنا کلام القا کرتا ہے اور پیغمبر اس کو محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ کلام اسی زبان اور اسلوب میں ہوتا ہے جو پیغمبر یا اس کے مخاطبوں کے لیے نامانوس نہ ہو۔ وحی کے ایک طریقہ میں اللہ تعالیٰ نبی کے پاس اپنا فرشتہ بھیجتا ہے جو اللہ کے حکم سے اس کا پیغام اس کے دل پر القاء کرتا ہے۔ وحی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ پردے کی اوٹ سے پیغمبر سے مخاطب ہوتا ہے۔ پیغمبر اللہ کا کلام اور اس کی آواز سنتا ہے لیکن اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ اللہ کے حکم سے فرشتہ انسانی جسم کے ساتھ نبی کے سامنے آ کر اس کو کوئی کام عملاً کر کے دکھاتا ہے جس کی تعلیم نبی نے اپنی قوم کو دینی ہوتی ہے۔ مختلف انبیاء کے احوال میں وحی کے ان طریقوں کا استعمال ملتا ہے۔

وحی کے ذریعے انبیاء نے دین حق سے آگاہی حاصل کی، کلام الٰہی ان کے دلوں پر نازل ہوا جس کو انہوں نے خود بھی ازبر کر لیا اور اپنے ساتھیوں کو بھی سکھا دیا۔ حق و باطل کی کشمکش میں اپنی جدوجہد کے دوران انہوں نے اپنی مشکلات میں رہنمائی پائی۔ وحی کی روشنی میں انہوں نے اپنے کام کی منصوبہ بندی کی، کبھی کوئی بشارت پائی اور کبھی آئندہ پیش آنے والے خطرات پر متنبہ ہو گئے۔ اگر وہ کسی اقدام میں چوک گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بروقت ان کی چوک سے آگاہ کر دیا اور انہوں نے اپنا رخ درست کر لیا۔

وحی کی تعلیم، جس کو انبیاء نے اپنی اپنی قوم کے اندر پھیلایا، فطرت انسانی کے اندر ودیعت کردہ تصورات کو اجاگر کرنے کے لیے تھی۔ فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا شعور، اس کے سامنے جوابدہی کا احساس اور نیک و بد اور خیر و شر میں امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ وحی نے ان تصورات کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور ان کی تفصیل کر دی تا کہ انسان کسی شک و شبہ میں گرفتار نہ رہے۔ اس کے علاوہ وحی نے ان تصورات کے حق میں دلائل بھی فراہم کر دیے تا کہ ہر عاقل شخص جانچ پرکھ کر کے اطمینان قلب حاصل کر سکے۔ وحی نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہی کو واضح نہیں کیا بلکہ اللہ کی صفات بھی بیان کیں اور

ان صفات کے تقاضوں سے بھی آگاہ کیا۔ آخرت کے بارے میں پیدا ہونے والے اشکالات کو رفع کیا تو ساتھ ہی اس میں پیش آنے والی کیفیات کی تصویر کشی بھی کر دی۔ دنیا میں رہتے ہوئے انسان جن نشیب و فراز سے گزرتا ہے، وحی نے ان کی صحیح توجیہ کر دی تا کہ انسان کی کوئی غلط سوچ اس کو جادۂ حق سے ہٹانے کا باعث نہ بننے پائے۔ وحی نے نیکی اور بدی کے درمیان امتیاز کا فیصلہ انسان کی صوابدید پر نہیں چھوڑا بلکہ حرام و حلال کی واضح طور پر نشاندہی کر دی اور اس کے لیے قوانین تجویز کر دیے۔ اللہ تعالیٰ کی زمین پر نیابت کے تقاضے نہایت دوٹوک طریقہ سے انسان کے سامنے رکھے اور اقامت دین کا مطالبہ کیا۔ یعنی یہ کہ دین حق میں جن باتوں کے ماننے کا حکم دیا گیا ہے ان کو سچے دل سے مانو، جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان پر دیانت داری اور راستبازی کے ساتھ عمل کرو۔ لوگوں کی نگرانی کرتے رہو کہ وہ اس تعلیم سے منحرف نہ ہونے پائیں اور اہل بدعت اس تعلیم ہی کو نہ بدل دیں۔

تخلیق آدم کے بعد سے آج تک نہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی صفات، نہ آخرت کے تصور، نہ حلال و حرام یا نیکی و بدی کے درمیان امتیاز میں سے کوئی حقائق بدلے ہیں اور نہ انسانی فطرت میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ لہذا وحی کی تعلیم جس طرح پتھر کے زمانہ کے انسان کے لیے موزوں تھی اسی طرح آج کمپیوٹر کے زمانہ کے انسان کے لیے بھی کفایت کرتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ تمام انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ میں بنیادی طور پر ایک ہی دین پیش کیا۔ وہ نہ الگ الگ دینوں کی دعوت لے کر آئے اور نہ الگ الگ امتوں کی بنا ڈالی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ایک نبی کے جانے کے بعد اس کی امت نے دین میں بگاڑ پیدا کر دیا اور وحی کی تعلیم میں تحریف کر دی تو اللہ تعالیٰ نے اس بگاڑ کی اصلاح کے لیے دوسرے نبی بھیجے۔ بعض لوگوں نے تو ان کی بات سنی اور مان لی لیکن دوسروں نے اپنی تنگ نظری اور تعصب کے سبب سے اس کی مخالفت کی اور اپنے غلط موقف ہی پر قائم رہے جس کے نتیجہ میں امتوں کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔

وحی کی تعلیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر خاص شفقت فرماتے ہوئے ہمیشہ یہ اہتمام فرمایا کہ جس قوم کی طرف ہدایت بھیجنا مقصود تھا اسی قوم کی زبان میں وحی نازل ہوتی اور نبی بھی اسی قوم کا فرد ہوتا۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک علاقہ کے انسانوں کی زبان اور رہن سہن کے طور طریقے دوسرے علاقہ کے انسانوں کی زبان اور طور طریقوں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ کسی علاقہ میں باہر سے آنے والا شخص وہاں کے لوگوں کے مزاج کو سمجھتا اور نہ ان کی روایات سے آگاہ ہوتا ہے۔ لیکن قوم کا ایک فرد جو نسبی طور پر انہی سے تعلق رکھتا، انہی کی زبان میں بات چیت کرتا اور انہی کے اندر رہتا بستا ہو، وہ اس قوم کا مزاج شناس ہوتا، ان کی روایات سے پوری طرح واقف ہوتا اور ان کے نیک و بد کو سمجھتا ہے۔ لہذا جس طرح

وحی کی زبان ہمیشہ وہ منتخب کی گئی جو قوم کی زبان تھی، اسی طرح نبی بھی اسی قوم کے فرد ہوتے جس کی اصلاح کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی۔

تاریخ انسانی میں بارہا یہ حادثہ بھی پیش آیا کہ بعض قومیں اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ کر فساد کی راہ پر چل کھڑی ہوئیں۔ اس کا سبب وہ اختیار تھا جو انسان کو اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔ اس طرح کی قوموں کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے پے در پے نبی بھیجے جو نہایت دردمندی کے ساتھ ان کو راہ راست کی طرف لوٹنے کی دعوت دیتے اور غلط کار لیڈروں اور سرداروں کے مشوروں اور فساد کے انجام بد سے خبردار کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی قوموں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے باغیانہ رویہ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ یہ برداشت نہیں کرتا کہ انسان اپنے مقصد تخلیق کی نفی کرتے ہوئے اس کی زمین پر دندناتا پھرے۔ نبیوں کے اس خیر خواہانہ مشورہ کے باوجود معاشرہ کے سرکش لوگوں کا وطیرہ یہ رہا کہ انہوں نے نبیوں کو اپنے مفادات کی راہ کا سنگ گراں سمجھا۔ ان کی تعلیم کو انہوں نے نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ اس کو جھٹلانے کے مجرم ہوئے۔ بعض بد بخت قومیں اپنے درمیان نبیوں کا وجود برداشت کرنے پر تیار نہ ہوئیں۔ تاریخ میں کتنے ہی انبیاء و مصلحین کو قتل کرنے کے واقعات ملتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل انبیاء خصوصی اختیارات دے کر ان قوموں کی طرف بھیجے۔ انہوں نے قوموں کو اللہ کا پیغام دھیمے انداز میں بھی پہنچایا اور ڈنکے کی چوٹ بھی۔ انہوں نے بے حس لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کیا۔ ان کی بعثت کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ ان نبیوں کی دعوت کو ماننا لازم ہے۔ یہ ہر ہر پہلو سے اس کی وضاحت کریں گے، قوم کے ہر اعتراض کا جواب دیں گے اور لوگوں کے اشکالات کو رفع کرنے اور دعوت کو ان کے دلوں میں اتارنے کے لیے ہر موزوں طریقہ اختیار کریں گے۔ قوم کو اپنی اصلاح کے لیے معین وقت دیا جائے گا جس میں نہ کوئی اضافہ کیا جائے گا نہ کمی۔ اگر قوم نے ان نبیوں کی دعوت کو رد کیا اور ان کی ذات کے لیے خطرہ بنی تو رب کا قہر اس پر نازل ہوگا۔ نبی کو کوئی گزند نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ قوم پر غلبہ پانا اس کا مقدر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی اختیارات کے حامل یہ خاص نبی 'رسول' کہلائے۔ کسی قوم نے جب اپنے رسول کو جھٹلایا تو جب اس قوم کو اصلاح کے لیے دی گئی مدت ختم ہوئی تو قوم کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ لیکن رسول اور اس پر ایمان لانے والے لوگ اس تباہی سے محفوظ رکھے گئے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد زیادہ ہوئی تو اللہ کی نصرت ان کو حاصل ہوئی اور بزور شمشیر انہوں نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پالیا۔

روئے زمین کی آبادکاری کا آغاز حضرت آدمؑ اور حوا دو افراد کے کنبہ سے ہوا۔ ان کی نسل سے جو لوگ پیدا ہوئے ان کی ضروریات محدود اور مسائل مخصوص تھے۔ اس اولین معاشرہ کے لیے حضرت

آدم علیہ السلام نبی مقرر کیے گئے اور انہوں نے اپنی اولاد کو رب کی ہدایت سے آگاہ کیا۔ جوں جوں آبادی میں اضافہ ہوا لوگ ابتدائی خطہ سے دوسرے علاقوں میں پھیلنے لگے۔ اب کنبوں کی بجائے خاندان اور قبیلے وجود میں آئے۔ معاشرہ کی وسعت کے ساتھ انسانوں کے باہمی تعلقات و معاملات میں رہنمائی ضروری ہوئی جس کی روشنی میں وہ اپنے مسائل حل کر سکیں اور آپس کے جھگڑوں کو عدل و انصاف کے ساتھ طے کر سکیں۔ چنانچہ آدم علیہ السلام کے بعد جو نبی مبعوث ہوئے ان کے پاس اپنے اپنے معاشروں کے لیے وحی کی تعلیمات زیادہ تھیں اور ان کا دائرہ عمل بھی وسیع تر تھا۔

قدیم ترین قوم، جو اپنے رسول کی تکذیب کے جرم میں صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئی، قوم نوح ہے۔ اس قوم نے خدائے واحد کے بجائے متعدد بت تراش کر ان کو شریک خدا مان لیا اور ان کی پوجا کرنے لگی۔ اس کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے۔ انہوں نے قوم کو ایک رب کی عبادت کی دعوت دی۔ اپنی تعلیم کو نہایت مدلل انداز میں پیش کیا اور قوم کو راہ راست پر لانے کے لیے ہر حربہ آزمایا، اس کو قائل کرنے کے لیے رازدارانہ بھی اور ڈنکے کی چوٹ بھی اپنی بات پہنچائی اور تکذیب کے نتیجہ میں اسے اللہ کی پکڑ سے بھی ڈرایا لیکن تھوڑے سے لوگوں کے سوا قوم نے ان کی بات نہ مانی۔ نہایت طویل جدوجہد کے بعد حضرت نوحؑ نے اپنی بے بسی کا اظہار اپنے رب کے سامنے کیا تو ان کو ایک کشتی بنانے کا حکم ہوا۔ ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ صرف اہل ایمان کو اس کشتی میں سوار کریں جن کو ایک طوفانی بارش کے عذاب سے بچا لیا جائے گا جبکہ ان کو جھٹلانے والے بارش کے سیلاب میں غرق کر دیے جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بے پناہ سیلاب نے کفار کو غرق کر دیا اور اہل ایمان نے بارش کا پانی اترنے کے بعد از سر نو زندگی کا آغاز کیا۔

قوم نوح کی تباہی کے بعد ملک میں طاقت پکڑنے والی ایک سرکش اور مغرور قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام رسول بنا کر بھیجے گئے۔ انہوں نے اپنی قوم کو رب کی ہدایت کی یاددہانی کرائی اور جن خرابیوں میں وہ مبتلا ہو چکی تھی ان سے بچانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ لیکن یہ قوم حضرت ہودؑ کا مذاق اڑاتی اور ان کو دھمکیاں دیتی رہی۔ وہ مسلمان ہونے والوں کو اذیتیں دیتی۔ اس نے ایمان لانے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ قوم عاد نے اصلاح کے لیے خدا کی طرف سے مقرر کردہ مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا، یہاں تک کہ رسول سے عذاب لانے کا مطالبہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو تو ہجرت کا حکم دے دیا اور نافرمان قوم کو تند و تیز سرد ہوا کے عذاب سے دوچار کر دیا جس سے قوم عاد کی جڑ کٹ گئی۔ عاد کے جانشینوں میں قوم ثمود انہی کے نقش قدم پر چل کر اپنے رسول حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی مرتکب ہوئی اور انہی کے انجام کو پہنچی۔

اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل (موجودہ عراق) میں ایک ایسی قوم کے اندر پیدا ہوئے جو شرک میں بری طرح ملوث تھی۔ بعثت کے بعد انہوں نے اپنے والد، اپنی قوم، بتکدوں کے پجاریوں، حتیٰ کہ بادشاہ تک رب کی وحدانیت کا پیغام پہنچایا اور ان کے مشرکانہ عقائد کے خلاف ایسے دلائل دیے جن کا جواب کسی سے بن نہ آیا۔ اس کے باوجود سب نے ان کی تکذیب کر دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان پر حجت تمام کرنے کے لیے بتکدے کے بتوں کو پاش پاش کر کے اپنی قوم پر ثابت کیا کہ ان کے یہ معبود نہ کسی قوت ہی کے مالک ہیں اور نہ اپنا دفاع کرنے ہی پر قادر ہیں، لیکن قوم تھی کہ اس نے محکم دلیلوں سے قائل ہونے کے بجائے اپنے رسول کو آگ میں جلانے کی سازش تیار کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تو آگ سے محفوظ رکھا لیکن ان کی نافرمان قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں ایک اولوالعزم رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر کے حکمران فرعون کی طرف بھیجے گئے۔ فرعون بڑے جاہ و جلال والا اور اپنے آپ کو خدا کا اوتار سمجھتا تھا۔ پورے ملک میں اس کے بت پوجے جاتے اور عملاً اسی کو خدا سمجھا جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو راہ راست پر لانے کی بے حد کوشش کی لیکن اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ فرعون نے اپنے پروپیگنڈا سے اپنی قوم کو مرعوب کر لیا اور وہ اس کے دام تزویر میں سے نہ نکل سکی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بالآخر اہل ایمان کو، جن کی بڑی تعداد بنی اسرائیل پر مشتمل تھی، ساتھ لیا اور مصر سے ہجرت کر گئے۔ فرعون اور اس کی فوج نے ان کا تعاقب کیا۔ راستہ میں سمندر کی پٹی حائل ہوتی تھی۔ حضرت موسیٰ وہاں پہنچے تو سمندر کی اس پٹی میں پانی ہٹ جانے کے باعث ایک گزرگاہ نمودار ہوگئی جس میں سے اہل ایمان گزر کر دوسرے کنارے پر بحفاظت جا اترے۔ فرعون اور اس کی فوج جب سمندر میں داخل ہوئی تو پانی مل گیا اور تعاقب کرنے والے غرق دریا ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تاریخ انسانی میں پہلی بار احکام الٰہی لکھے ہوئے عطا ہوئے۔ ان پر نازل ہونے والی وحی تورات کی شکل میں ایک عالم کے لیے صدیوں تک ہدایت کا وسیلہ بنی رہی۔

وقت گزرنے کے ساتھ حضرت موسیٰ کے پیرو بھی اللہ کی ہدایت کو پس پشت ڈالنے لگے تو ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے پے در پے متعدد انبیاء بھیجے لیکن ان کا بگاڑ درست نہ ہوا۔ بالآخر ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور رسول مبعوث ہوئے جنہوں نے آ کر ان کو تکذیب کے برے انجام سے ڈرایا۔ اس کے باوجود قوم نے ان کو رسول ماننے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی۔ البتہ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم دوسری قوموں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی اور ان کے ماننے والے ایک وسیع علاقے میں برسر اقتدار آ کر اپنے مذہب کو پھیلانے میں کامیاب ہوئے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ انبیا اور رسول وہی ہیں جن کے نام آسمانی صحیفوں یا تاریخ میں محفوظ ہو چکے

ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں کا تعلق نسل انسانی کی ہدایت کے ساتھ ہے لہٰذا جہاں جہاں انسان جا کر آباد ہوا اسے آسمانی رہنمائی کی ضرورت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق اس کا انتظام کیا۔ ہر خطہ اور قوم میں انبیا کی بعثت ہوئی اور جب شریر لوگ حد سے بڑھ گئے اور انہوں نے نبیوں کی دعوت پر کان نہیں دھرے تو رسول بھی مبعوث ہوئے۔ پھر جب قوموں نے ان کی آمد کو بھی نظر انداز کر دیا تو ایسی قومیں صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ تباہ ہونے والی قدیم بستیوں کے کھنڈرات مختلف ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ کھدائی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستیاں کسی ناگہانی آفت کا شکار ہوئیں اور ان کے باسیوں کو گھروں سے نکلنے کا وقت بھی نہ ملا۔ تو عین ممکن ہے کہ یہ ماضی بعید میں اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی مجرم ٹھہریں اور ان کو خدا کے عذاب نے آ گھیرا۔

بظاہر رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کا برا انجام نہایت تکلیف دہ نظر آتا ہے اور یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ بندوں کے معاملہ میں اس قدر سخت رویہ اللہ رب العزت کی شان کریمی کے منافی ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے اگر چند حقائق پیش نظر رہیں تو پھر یہ معاملہ عدل کے منافی نہیں ٹھہرتا۔ مثال کے طور پر یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان زمین میں کوئی خودرو پودا نہیں ہے جس کا کوئی مقصد تخلیق نہ ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہایت اہتمام سے پیدا کیا، کارکنان قضا و قدر سے اس کو سجدہ کروایا، اس کو غیر معمولی صلاحیتیں عطا کیں اور بیشتر مخلوقات کو اس کے تابع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ اللہ کے نائب کی حیثیت سے اپنے فرائض اچھے طریقہ سے ادا کر سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے نہیں چھوڑا بلکہ اس کے دل و دماغ میں روشنی پیدا کی، اس کے گرد و پیش کو سبق آموز بنایا، اس کو راہ راست پر رکھنے کے لیے اس کو وحی کی رہنمائی دی، اس کو حقیقت سے آگاہ رکھنے اور اس پر حجت تمام کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کیا اور ان کے ساتھ آسمانی صحیفے اتارے۔ اس غیر معمولی اہتمام کے بعد اگر شریر لوگ دنیا کو فساد اور بدی سے بھر دیں، آسمانی ہدایت کا مذاق اڑائیں، من مانی حرکتیں کر کے انبیاء کی تعلیم کی نفی کریں، کوئی نیک بخت ان کو ٹوکنے کی جرأت کرے تو اس کو اپنے رستے سے ہٹانے سے بھی دریغ نہ کریں، تو ان شریر لوگوں کا جرم معمولی نہیں رہ جاتا۔ یہ لوگ انسان کے مقصد تخلیق کی علانیہ نفی کے مرتکب ہوتے اور رب کائنات نے بندوں کی رہنمائی کا جو وعدہ کر رکھا ہے اس کے ایفا میں رکاوٹ پیدا کرنے کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اس ساری اسکیم کو ناکام بنانے کی ایک کوشش ہے جو مالک کائنات کے پیش نظر ہے۔ پس شریر قوموں پر عذاب بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ اپنی شیطنت کے باعث اللہ کے ان مخلص و باوفا بندوں کے لیے آزمائش کا سبب نہ بنیں جو اللہ کے باغی نہیں ہیں اور اپنے مالک کی ہدایت کی روشنی میں چلنے اور زندگی گزارنے کے آرزومند ہیں۔

عبدالخالق فاروقی

قرآنی تمثیلات اور ان کا فلسفہ

(مطالعۂ تدبر قرآن کی روشنی میں)

تمثیل کا مفہوم اور اہمیت:

قرآن مجید میں تمثیل بیان کرنے کے لیے 'ضرب مثل' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو حکمت و موعظت کی باتیں تمثیل کے اسلوب میں پیش کرنے کے معنی دیتا ہے۔ تمثیل کا اسلوب حقائق کی تعلیم و تفہیم کے لیے سب سے زیادہ موثر اور کارگر ہوتا ہے۔ اعلیٰ حقائق اور روحانی لطائف کو جب تک تمثیل کا جامہ نہ پہنایا جائے اس وقت تک وہ عام عقل کی گرفت میں نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانی تعلیم و تذکیر میں اس صنف کلام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

تمثیل میں مبالغہ یا تخیل کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک معنوی حقیقت ایک مادی پیرایہ میں متشکل ہو کر سامنے آ گئی ہے یا نہیں۔ تمثیل کے اجزائے ترکیبی کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ ایک حقیقت کو نگاہوں کے سامنے مصور کر دینے کے لیے جو چیز بھی مفید ثابت ہو سکتی ہو تمثیل میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، خواہ وہ مکھی ہو یا مچھر یا مکڑی۔ چنانچہ قرآن حکیم اور انجیل میں اعلیٰ حقائق کی تفہیم و تذکیر کے لیے بعض مقامات پر ایسی ہی ادنیٰ مخلوق کو تمثیلات میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً مشرکین کے معبودوں کی بے بسی بیان کرنے کے لیے تمثیل بیان کی کہ وہ مکھی بھی پیدا کرنے پر قادر نہیں بلکہ مکھی اگر ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اس سے بچاؤ بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح شرکاء و شفعاء پر ان کو جو اعتماد تھا اس کی بے حقیقتی کی مثال مکڑی کے جالے سے دی۔ یہود دین کے اصولوں سے بے پروا ہو کر اس کی جزئیات کا جو اہتمام کرتے حضرت مسیح علیہ السلام نے اس کو مچھر کے چھاننے اور اونٹ کے نگل جانے سے تشبیہ دی۔ یہ تمثیلات اس لحاظ سے نہایت اعلیٰ ہیں کہ ان میں جو حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ ان تمثیلوں کے پیرایہ میں نہایت خوبی کے ساتھ ایک عام آدمی کی سمجھ میں بھی آ جاتے ہیں۔

علم و معرفت کے قدردان ان تمثیلوں کی بڑی قدر کرتے اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا کلام اس صنف سے بھرا پڑا ہے۔ تورات، انجیل اور زبور سب امثال سے معمور ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحیفۂ حکمت کا تو نام ہی امثال ہے۔ احادیث نبی ﷺ میں بھی

تمثیلات بکثرت ملتی ہیں۔ قرآن مجید کے اندر نہایت خوبصورت تمثیلیں بیان ہوئی ہیں جس کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

تمثیلات کی اس قدر اہمیت و افادیت کے باوجود جو لوگ علم و معرفت کے دشمن اور خواہشات نفس کے غلام ہوتے ہیں، انہیں ان تمثیلات سے بڑی چڑ ہوتی ہے کیونکہ یہ تمثیلات ان کے لیے وہ حقائق بے نقاب کرتی ہیں جن کا بے نقاب ہونا ان کے نفس کی خواہشات کے خلاف پڑتا ہے۔ ان حقائق پر براہ راست حملہ کرنا تو ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا جو وہ تمثیل پیش کر رہی ہوتی ہے کیونکہ وہ روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے، البتہ تمثیل کے کسی جزو کی آڑ لے کر وہ اس کے خلاف اپنا غصہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً تمثیل میں مکھی یا مچھر کا ذکر آ گیا ہے تو وہ تمثیل خواہ کتنی ہی حقیقت افروز ہو، وہ کہیں گے کہ "یہ کیا فضول تمثیل ہے۔ اگر یہ خدا کا کلام ہے تو کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی ملتے ہیں"۔ اس بات کو قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> "اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی تمثیل بیان کرے خواہ وہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی۔ تو جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی بات حق ہے ان کے رب کی جانب سے، رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس تمثیل کے بیان کرنے سے اللہ کا کیا منشا ہے! اللہ اسی چیز سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اور وہ گمراہ نہیں کرتا مگر انہی لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے ہیں"۔ (البقرہ:۲۶)

تمثیلات سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اس نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے اتارا ہے۔ اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر انسان دنیا اور آخرت میں فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے تاہم قرآن مجید سے استفادہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو طلب ہدایت کے سچے جذبہ کے ساتھ اس کی تلاوت کریں اور اس میں غور و تفکر سے کام لیں۔ قرآن حکیم میں جو تمثیلات آئی ہیں وہ اپنے اندر علم و معرفت کے خزانے رکھتی ہیں مگر وہ صرف انہی لوگوں کے لیے نفع بخش اور بصیرت افروز ثابت ہو سکتی ہیں جو دل و جان سے ان کی قدر کریں اور ان میں جو حقائق و عبر چھپے ہوتے ہیں ان پر تفکر و تدبر کریں اور ان سے یاد دہانی حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں تمثیلیں بیان کی گئی ہیں بعض تو ان کے آخر میں یہ کہا گیا ہے:

> وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَ مَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ.
> (العنکبوت:۴۳)

اور یہ تمثیلیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے غور کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔

یا

وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ. (الحشر:۲۱)

اور یہ تمثیلات ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں

پس ثابت ہوا کہ قرآنی تمثیلات سے صرف اسی صورت میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ ان پر غور و فکر کیا جائے اور ان کو سمجھنے کے لیے عقل و بصیرت کی روشنی استعمال کی جائے۔

قرآن مجید میں بیان کردہ تمثیلات:

اب ہم قرآن مجید کی چند تمثیلات بیان کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ حقائق کو تمثیل کے اسلوب میں کس قدر خوبصورت پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔

مشرکین کے خداؤں کا ضعف و بے چارگی:

انسان کسی کو معبود مانتا ہے تو اس لیے مانتا ہے کہ اس سے اس کے اپنے ضعف و ناتوانی کا مداوا ہوتا ہے لیکن مشرکین نے معبود ان چیزوں کو بنایا ہے جو ان سے بھی بڑھ کر عاجز و بے بس ہیں۔ ان کی عاجزی و بے بسی قرآن مجید میں ایک مقام پر تمثیل کے انداز میں یوں بیان کی گئی ہے:

''اے لوگو! ایک تمثیل بیان کی جاتی ہے تو اس کو توجہ سے سنو! جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا کر سکنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ اس کے لیے سب مل کر کوشش کریں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس کو بچا بھی نہیں پائیں گے۔ طالب اور مطلوب دونوں ہی ناتواں!''۔ (الحج:۷۳)

غور فرمائیے، جھوٹے خداؤں کی بے بسی اور عاجزی کے بیان میں کس قدر بصیرت افروز تمثیل ہے۔ سورہ العنکبوت آیت ۴۱ میں فرمایا کہ ''ان لوگوں کی تمثیل جنہوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں بالکل مکڑی کی تمثیل ہے جس کا گھروندا سب سے کمزور ہوتا ہے''۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شرک کی اساس پر جو گھروندا بنایا اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ اس کی حیثیت مکڑی کے جالے کی سی ہے۔ سورہ الرعد آیت ۱۴ میں فرمایا کہ ''حقیقی پکار کا سزاوار تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں تو یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف بڑھائے کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے جب کہ وہ اس کے منہ تک کسی طرح پہنچنے والا نہ ہو''۔ یعنی خدا کے سوا کسی دوسرے کو پکارنا سراب کو

پانی سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا خالی شرکاء و شفعاء کا پکارنا محض صدا بصحرا ہے اور تیر بے ہدف!۔

توحید کے انفسی دلائل:

توحید کی ایک بہت بڑی انفسی دلیل فطرت انسانی کا علو ہے۔ بلند حوصلہ مخلوق ہونے کی بنا پر انسان کبھی کسی کی غلامی پر راضی ہونے والا نہیں ہے۔ ایک خدا کی غلامی اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہے اور وہ اپنی گوناگوں ناتوانیوں کی وجہ سے اس کے سہارے کے بغیر طمانیت نہیں پاتا لیکن دوسروں کی غلامی کے لیے اس کے اندر اس طرح کا نہ صرف یہ کہ کوئی تقاضا نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف ایک شدید بیزاری موجود ہے بشرطیکہ اس کی فطرت بگڑ نہ چکی ہو۔ اس انسانی فطرت کی بنا پر قرآن نے موحد و مشرک کی ایک تمثیل بیان فرمائی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے نہ کہ شرک کو۔ فرمایا:

''اللہ تمثیل بیان کرتا ہے ایک غلام کی جس میں کئی مختلف الاغراض آقا شریک ہیں اور ایک دوسرے غلام کی جو پورے کا پورا ایک ہی آقا کی ملک ہے۔ کیا دونوں کا حال یکساں ہوگا۔ سزاوار شکر صرف اللہ ہے لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں سمجھتی''۔ (الزمر:۲۹)

عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکر گزاری اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے۔ انسانی فطرت کی اس عدل پسندی کی بنا پر اس سے یہ سوال کیا گیا کہ جن کو تم خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات و حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو۔ دو تمثیلات ملاحظہ ہوں:

''اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا اور اس کی جس کو ہم نے اپنی جانب سے اچھا رزق دے رکھا ہے جس میں سے وہ پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔ کیا یہ یکساں ہوں گے؟'' (النحل:۷۵)

(ظاہر ہے کہ یہ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے تو پھر تم خدا اور اس کے مملوکوں کو کس طرح یکساں کر دیتے ہو)۔

''اللہ تمثیل بیان کرتا ہے دو شخصوں کی جن میں سے ایک گونگا بہرا غلام ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں، وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، وہ جہاں کہیں بھی اس کو بھیجتا ہے وہ کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جو آزاد ہے، دوسروں کو عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے اور خود بھی سیدھے راستہ پر ہے۔ کیا یہ دونوں شخص یکساں

ہوں گے۔

(اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر تم خدا اور اس کی عاجز و بے بس مخلوقات کو یکساں کیسے کیے دیتے ہو)۔ (النحل: ۷۶)

اخلاص سے عمل کے اجر میں افزونی کی تمثیل:

کسی نیکی میں جس قدر اخلاص اور ایثار و فدویت کا جذبہ کارفرما ہوگا اس کے اجر میں اسی قدر بڑھوتری اور افزونی ہوگی۔ اس حقیقت پر اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ انفاق کو موضوع بنا کر ایک بصیرت افروز تمثیل کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی۔ فرمایا:

''ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اس طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی''۔ (البقرہ: ۲۶۱)

اسی چیز کو ایک اور تمثیل کے ذریعہ یوں بیان کیا گیا:

''اور جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی اور اپنے نفسوں کی تربیت کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے سطح مرتفع پر ایک باغ ہو۔ اگر زور کی بارش ہوئی تو دوگنا پھل لایا اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہوئی تو پھوار ہی کافی ہو جائے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے''۔ (البقرہ: ۲۶۵)

ریاکاری اور عقیدۂ کفر و شرک کے ساتھ کوئی نیکی قبول نہیں:

جو انفاق احسان داری، دل آزاری اور ریاکاری کے ساتھ کیا جائے اور جو ظاہری طور پر نیک عمل عقیدۂ کفر و شرک اور نفاق کے ساتھ سرانجام دیا جائے، عنداللہ اس کا کوئی اجر مرتب نہیں ہوتا۔ اس بات کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دلنشین تمثیلات کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ سورہ البقرہ آیت ۲۶۴ میں ایسے لوگوں کی تمثیل ایک ایسے کسان سے دی گئی ہے جس نے ایک ایسی چٹان پر فصل بوئی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ جب فصل اگ آئی تو ایک دن زور کی بارش ہوئی اور پانی کا ریلا فصل کو مٹی سمیت بہا کر لے گیا اور باقی صاف چٹان رہ گئی۔ سورہ آل عمران آیت ۱۱۷ میں ایسے لوگوں کے اعمال ضائع و برباد ہو جانے کی تمثیل ایک ایسی کھیتی سے دی ہے جس پر اچانک رات کو پالے والی ہوا چل جائے اور تمام کھیتی کو برباد کر کے رکھ دے۔

سورہ ابراہیم آیت ۱۸ میں ایسے لوگوں کے اعمال کو راکھ سے تشبیہ دی جس پر آندھی کے دن باد تند چل جائے اور اس کو اڑا کر لے جائے۔

قرآن مجید کی قوت تاثیر و تسخیر:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو انسان کو اس کا مقصد زندگی اور طرز زندگی بتانے کے لیے نازل کی گئی۔ اس حوالہ سے قرآن مجید نے انسان کی تعلیم و تذکیر اور اتمام حجت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے لیکن انسان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ وہ ایسی کتاب سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس کی شدت تاثیر اور قوت تسخیر کا تو یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمثیلی پیرائے میں فرمایا:

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کی خشیت سے سرنگوں اور پاش پاش ہو جاتا''۔ (الحشر: ۲۱)

مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن کا قصور نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دلوں کی شقاوت اور سختی ہے کہ وہ اس سے پسیج نہیں رہے اور اس کی دعوت و تعلیم قبول نہیں کر رہے ہیں۔

آباء کی اندھی تقلید پر اڑے رہنے والوں کی تمثیل:

اگر آباء و اجداد عقل و بصیرت اور ہدایت کی روشنی رکھتے ہوں تو ان کی تقلید کا ایک جواز ہے لیکن معاملہ اگر برعکس ہو تو ان کی تقلید پر اصرار اور دعوت حق سے فرار عقل و فطرت کے منافی ہے۔ جب قرآن کی دعوت بلند ہوئی اور لوگوں سے کہا گیا کہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت و تعلیم کا اتباع کرو تو عقل و ہدایت سے محروم آباء کی اندھی تقلید پر اصرار اس دعوت پر ایمان لانے میں قریش کے لیے حجاب بن گیا۔ ایسے عقل کے اندھوں اور بصیرت سے محروم لوگوں کی تمثیل بھیڑ بکریوں کے گلے سے دی گئی جو عقل و ادراک سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ گڈریئے کی آواز بے شک ان کے کانوں سے ٹکراتی ہے لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ وہ ان سے کیا کہہ رہا ہے اور کس مقصد کے لیے پکار رہا ہے۔ (البقرہ: ۱۷۰)

دنیوی زندگی کی ایمان سے روکنے والی زینت و رونق عارضی ہے:

جو لوگ حلاوت ایمان سے لذت آشنا نہیں ہوتے ان کی زندگی سراسر لہو و لعب، زینت و آرائش کے شوق، مال و اولاد کی کثرت اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے باہمی مقابلہ سے عبارت ہوتی ہے۔ کفار ایسی زندگی پر ریجھے ہوتے ہیں، اس میں پھنس کر حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اس خود فریبی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اب آسمان یا زمین سے کوئی خطرہ انہیں پیش نہیں آ سکتا۔ ایسے لوگوں کی غلط فہمی اور خود

فریبی دور کرنے کے لیے تمثیل بیان کی گئی کہ تمہاری ایسی زندگی یوں ہے جیسے آسمان سے بارش ہو جس سے فصلیں خوب نشوونما پائیں۔ کسان اپنی کھیتی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہوتے ہیں۔ پھر کھیتی سوکھنے لگتی ہے، پھر کاٹ لی جاتی ہے، پھر چورا چورا ہو جاتی ہے اور ہوائیں اس کو اڑاتی پھرتی ہیں۔ ایسے ہی اس زیب و زینت کی رونق عارضی ہے اور یہ بہار خزاں کا شکار ہونے والی ہے۔ یہ مضمون تمثیل کے اسلوب میں سورہ یونس آیت ۲۴، سورہ کہف آیت ۴۵، اور سورہ حدید آیت ۲۰ میں بیان کیا گیا ہے۔

مومن اور کافر کی ذہنیت کا فرق:

مومن اور کافر کی ذہنیت میں فرق یہ ہے کہ کافر دنیوی دولت اور نعمت کے ملنے پر اتراتا ہے اور اس چیز کو اپنی قابلیت کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اس ثروت کو اپنے برسرِ حق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس بندہ مومن ہر نعمت کو اللہ کا عطیہ اور امانت تصور کرتا ہے، اس پر منعمِ حقیقی کی شکر گزاری کو واجب سمجھتا ہے اور اس پر اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے مسئول گردانتا ہے۔ ذہنیت کے اس فرق کو تمثیل کے اسلوب میں اس طرح واضح کیا:

> ''اور ان کو دو شخصوں کی تمثیل سناؤ۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگوروں کے دو باغ بنائے۔ ان کو کھجوروں کی قطار سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی کے قطعات بھی رکھے۔ دونوں باغ خوب پھل لائے۔ ان میں ذرا کمی نہیں کی۔ اور ان کے بیچ بیچ میں ہم نے نہر بھی دوڑا دی۔ اور اس کے پھلوں کا موسم ہوا تو اس نے اپنے ساتھی سے بحث کرتے ہوئے کہا میں تم سے مال میں بھی زیادہ اور تعداد کے اعتبار سے بھی زیادہ طاقتور ہوں اور وہ اپنے باغ میں اس حال میں داخل ہوا کہ وہ اپنی جان پر آفت ڈھا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ کبھی برباد ہو جائے گا اور میں قیامت کے آنے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا ہی گیا تو اس سے بھی بہتر مرجع پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے بحث کرتے ہوئے کہا، کیا تم نے اس ذات کا انکار کیا ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر تم کو ایک مرد بنا کر کھڑا کیا لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے یوں کیوں نہ کہا کہ یہ جو کچھ ہے سب اللہ کا فضل ہے۔ اللہ کے بدون کسی کو کوئی قوت حاصل نہیں۔ اگر تم مال و اولاد کے اعتبار سے مجھے اپنے سے کم دیکھتے ہو

تو امید ہے کہ میرا رب تمہارے باغ سے بہتر باغ مجھے دے اور تمہارے باغ پر آسمان سے کوئی ایسی گردش بھیجے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا اس کا پانی نیچے اتر جائے اور تم اس کو کسی طرح نہ پا سکو۔ اور اس کے پھلوں پر آفت آئی تو جو کچھ اس نے اس پر خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا پڑا تھا اور وہ کہہ رہا تھا کہ اے کاش! میں کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بناتا''۔ (کہف: ۳۲ تا ۴۲)

قلب مومن میں نورِ ایمان کی تمثیل:

اللہ ہی زمین و آسمانوں کا نور ہے۔ جس بندہ مومن کے پاس یہ نور ہے وہ روشنی میں صراطِ مستقیم پر ہے اور جو شخص اس نور سے محروم ہے وہ ایک عالمِ ظلمات میں بھٹک رہا ہے اور اس شخص کے لیے یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے۔ قلب مومن میں اس نور کی تمثیل اللہ نے یوں بیان فرمائی ہے:

> ''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (قلب مومن میں) اس کے نورِ ایمان کی تمثیل یوں ہے کہ ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ ایک چمکتے تارے کے مانند ہو، چراغ ایک ایسے شاداب درخت زیتون کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ گویا آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ روشنی کے اوپر روشنی! اللہ اپنے نور کی ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں کی رہنمائی کے لیے بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے''۔ (النور: ۳۵)

قلب مومن میں نور کی اس تمثیل سے واضح ہوتا ہے کہ ایسا دل حالات سے ڈانواں ڈول نہیں ہوتا۔ یہ ان لوگوں کے سینوں کو اپنا نشیمن بناتا ہے جن کی فطرت فساد اور بگاڑ سے محفوظ ہو۔ ایمان کی روشنی فطرت کے نور کو دوبالا کرتی ہے اور بندۂ مومن کا دل مطلقِ انوار بن جاتا ہے۔ جو لوگ فطرت کے روغن کو ضائع کر دیتے ہیں ان کے دل ایمان کی روشنی نہیں پکڑتے۔

معرکۂ حق و باطل میں جیت آخر حق کی ہوگی:

سورہ الرعد آیت ۱۷ میں اللہ تعالیٰ نے دو تمثیلیں معرکہ حق و باطل کے منطقی انجام یعنی حق کی فتح نگاہوں کے سامنے لانے کے لیے بیان فرمائی ہیں۔ پہلی تمثیل بارش سے دی ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ آسمان سے پانی برستا ہے اور ندی نالے اور وادیاں اپنے اپنے ظرف کے موافق بہہ نکلتی ہیں پھر سیلاب کے اوپر جھاگ آ جاتا ہے۔ دوسری تمثیل بھٹی کی دھات سے دیتے ہوئے بتایا کہ اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں

کے اندر سے بھی ابھرتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسی قسم کی کوئی اور چیز بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ تو بے مصرف ہو کر اڑ جاتا ہے لیکن جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہوتی ہے وہ زمین میں ٹک جاتی ہے۔

ان دونوں تمثیلوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ کائنات اپنے مزاج سے ہر نافع کو باقی رکھنا چاہتی ہے اور غیر نافع کو برابر چھانٹتی رہتی ہے۔ اسی طرح اللہ حق و باطل کو ٹکراتا ہے تو باطل خس و خاشاک کی طرح اڑ جاتا ہے لیکن حق باقی رہتا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ وہ حق و باطل کی اس کشمکش میں جو قرآن کے نزول سے برپا ہوئی ہے، باطل کو مٹا دے گا اور قرآن کے حاملین باقی رہ جائیں گے۔

کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی تمثیل:

شرک کی نہ کوئی بنیاد عقل و فطرت کے اندر ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کی کوئی جڑ ہے اس کے برعکس توحید کی بنیاد عقل و فطرت میں بھی ہے اور عنداللہ بھی۔ اس اہم اور بنیادی حقیقت کو تمثیل کے ذریعے اس طرح اجاگر کیا گیا ہے فرمایا:

> ''کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی؟ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضائے آسمانی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اور کلمہ خبیثہ کی تمثیل ایک شجرۂ خبیثہ کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔ اسے ذرا ثبات حاصل نہ ہو''۔ (ابراہیم: ۲۴۔۲۵)

یہود کی دناءت و پستی اور کتمان و تکذیب کی تمثیل:

قوم یہود کی طویل تاریخ خدا کی نافرمانی، انبیاء سے گستاخی، کتمان حق، تحریف کتب الٰہی، فتنہ جوئی، زر پرستی، حب دنیا، حرص و آز اور دناءت و پستی کی ایک عبرت ناک داستان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے برابر ان میں انبیاء بھیجے اور ان کے لیے ہدایت کی روشنی کا اہتمام رکھا لیکن 'سمعنا وعصینا' ہمیشہ ان کا وطیرہ بنا رہا۔ ان کا یہ گمان تھا کہ ان کے علاوہ کوئی اور قوم کتاب الٰہی اور شریعت الٰہی کی حامل نہیں ہو سکتی۔ وہ خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں ایک پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی بعثت کی بھی پیش گوئی تھی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ پیغمبر موعود بنی اسمٰعیل میں مبعوث ہوئے ہیں تو حسد اور عناد کی وجہ سے ان پر ایمان لانے سے محروم رہے بلکہ ان کی مخالفت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہود کے اس طرح برابر پستی کی

طرف جھکے رہنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی تمثیل کتے سے دی جو حرص و دناءت کی وجہ سے ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا چلتا ہے اور چکاریے یا دھتکاریے دونوں صورتوں میں اپنی زبان نکالے ہوئے رکھتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہود کی فطرت کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے''۔ (الاعراف: ۱۷۵۔۱۷۶)

کتاب الٰہی کی ناقدری، کتمان حق اور تکذیب کی پاداش میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مثال گدھے سے دی ہے جس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں لیکن اس کو خبر نہ ہو کہ ان میں کیا لکھا ہے اور وہ کیا پیغام دیتی ہیں۔ (الجمعہ: ۵)

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم:

سورہ الفتح آیت ۲۹ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی صفات اور اسلام کے تدریجی غلبہ و عروج کی ان تمثیلوں کا حوالہ دیا ہے جو اس سلسلہ میں تورات اور انجیل میں وارد ہوئی ہیں:

تورات میں ان کی جو صفات بیان ہوئی ہیں قرآن نے ان کو یوں بیان کیا کہ محمد رسول اللہ اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں کفار پر سخت اور آپس میں رحیم و شفیق ہیں۔ تم ان کو اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں رکوع و سجود میں سرگرم عمل پاؤ گے، سجود کے اثرات ان کے چہروں پر نمایاں ہوں گے۔ ان قدوسیوں کی یہ صفات تورات کی تمثیل میں یوں بیان ہوئی ہیں۔

> ''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑوں سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے دہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی''۔ (کتاب استثناء باب ۳۳)

قرآن کی تمثیل میں ان کے تدریجی ارتقاء کو اس طرح بیان کیا کہ جیسے کھیتی کا دانہ پہلے سوئی نکالتا ہے۔ پھر اس کو مزید سہارا ملتا ہے جس سے سوئی موٹی اور قوی ہو جاتی ہے اور کھیتی اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ انجیل میں یہ تمثیل یوں بیان ہوئی ہے:

> ''اس نے ایک اور تمثیل پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانہ کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے لیکن جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آ کر اس کی ڈالیوں میں بسیرا کرتے ہیں''۔ (انجیل متی، باب ۱۳)

افادات اصلاحی

سید اسحاق علی

رویت باری کا مسئلہ

ہمارے ہاں علم کلام میں رویت باری کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ رہا ہے۔ قرآن مجید میں واحد مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیان ہوئی ہے جنہوں نے کوہ طور پر اپنے چالیس روزہ قیام کے دوران اس شوق کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی ذات کا مشاہدہ کرا دے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکیں۔ ان کو جواب ملا کہ تم مجھے دیکھ نہیں سکو گے۔ البتہ پہاڑ کو دیکھو۔ میں اس پر اپنی تجلی ڈالوں گا۔ اگر وہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ گیا تب تم مجھے دیکھ سکو گے۔ جونہی رب کی تجلی پہاڑ پر پڑی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ گویا ان کے لیے رویت باری تعالیٰ ممکن نہیں ہوئی۔

موسیٰ علیہ السلام نے جو خداوند کو دیکھنے کا شوق ظاہر کیا تو اس میں ان کو قوم کے جذبات کا بھی خیال رہا ہوگا۔ ان کی قوم کا حال یہ تھا کہ وہ بار بار کہتے تھے کہ کیا بات ہے کہ خداوند صرف تم سے بات کرتا ہے، ہم سے کیوں نہیں کرتا، ہم سے بھی بات کرے تب ہمیں یقین ہو۔ قریش کے لیڈر بھی آنحضرت ﷺ سے یہ بات کہتے تھے کہ آخر آپ کے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ آپ پر وحی آتی ہے، ہم پر کیوں نہیں آتی ہے۔ نبی چونکہ قوم ہی کی رہنمائی کے لیے آتا ہے تو جو کچھ ان کے مطالبات ہوتے ہیں ان کا حل بھی وہ سوچتا ہے۔ اب باوجود اس کے کہ حضرت موسیٰ جانتے ہوں کہ انسان کے لیے رویت باری تعالیٰ کی تاب لانا ممکن نہیں، اس میں مشکلیں ہیں، لیکن اپنے اطمینان قلب کے لیے انہوں نے یہ درخواست کر ہی دی کہ اے رب! تو کلام کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تجھے دیکھوں بھی، تو تو مجھے اپنے کو دکھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جتنا کلام اللہ تعالیٰ سے کیا ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ آواز تو سنائی دی لیکن آواز کے پیچھے جو ہے وہ کیسا ہے، اس کی شکل وصورت کیا ہے، یہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں موسیٰ کو اطمینان دلا دیا اور یہ تعلیم ان کو اور ہم سب کو دے دی کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، اس لیے کہ ان ناسوتی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان آنکھوں کی طاقت اور استطاعت بہت محدود ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ روشنی ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور ہو سکتا ہے کہ آدمی اندھا ہو جائے۔ کان کی طاقت کا حال یہ ہے کہ اگر آواز ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو کان بہرے ہو جائیں اور کان کا پردہ پھٹ جائے۔ اسی طریقہ سے جتنی قوتیں انسان کو حاصل ہیں

ایک خاص حد تک ہیں۔ اس سے آگے اگر آپ ان پر زور آزمائی کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حاصل تو کچھ نہیں ہوگا، جو حاصل ہے وہ بھی ضائع ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ کو تعلیم دینے کے لیے اور ان کو اس معاملہ میں مطمئن کرنے کے لیے کہا گیا کہ پہاڑ کی طرف دیکھو اس پر میں اپنی تجلی ڈالوں گا۔ اور وہ اگر اس کو برداشت کر لے تب تو سمجھو کہ تم بھی برداشت کر لو گے۔ لیکن اگر یہ بے حس چیز میری تجلی کو برداشت نہ کر سکے تو یہ سمجھ لو کہ تم باحس ہو کر کس طرح اس کو برداشت کرو گے۔ موسیٰ کو یہ تعلیم اس لیے دی گئی کہ ان کی قوم اس طرح کی چیزوں کے لیے بہت مضطرب تھی تو موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تجلی اس لیے ظاہر نہیں کر سکتا کہ تم اس کی تاب نہیں لا سکتے۔ گویا اصل مشکل ہماری آپ کی ناتوانی ہے جس کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے۔

یہ ایک معقول بات ہے اور ہر ایک کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن صوفی حضرات مشاہدہ ذات کے قائل ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ تم حاصل کرتے ہو وہ الفاظ قرآن سے حاصل کرتے ہو۔ زیادہ سے زیادہ علم جو تم کو اس سے حاصل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم ہے جو اس کائنات کی مصنوعات سے تم حاصل کرتے ہو۔ تمہارے علم کے ذرائع بہت معمولی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارا علم بہت وسیع ہے، اس میں مشاہدہ ذات باری بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صوفی حضرات چاہے جو کچھ کریں، حضرت موسیٰ سے بڑے نہیں ہو سکتے۔ وہ اللہ کے جلیل القدر رسول تھے۔ مشاہدہ ذات کے معاملہ میں جب حضرت موسیٰ کو یہ تنبیہ ہوئی تو اب اگر کوئی گروہ یا فرد اس بات کا مدعی ہو کہ وہ خداوند تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے تو وہ قرآن کی اور خود اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتا ہے۔

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات کا نہیں بلکہ صرف اس کی صفات کا تصور کر سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی جو صفات ہیں ان کا کسی نہ کسی درجہ میں عکس اس نے ہمارے اندر بھی رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ علیم ہے تو علم کا کچھ شائبہ ہمارے اندر بھی ہے، وہ سمیع ہے تو سماع کا کچھ شعور ہم بھی رکھتے ہیں، وہ قدیر ہے تو قدرت کا کچھ احساس ہم کو بھی حاصل ہے۔ بہر حال یہ صفات ہیں جن کا ہم اندازہ کر سکتے ہیں۔ کائنات میں ہم مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خالق کائنات کی قدرت یہ ہے یا حکمت یہ ہے، اگرچہ اس کا تصور بہت ناقص ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم اپنے پیمانہ سے ناپتے ہیں۔ رہی اس کی ذات تو اس کا کوئی اشتراک ہمارے اور اس کے درمیان نہیں ہے۔ ہماری ذات میں مٹی اور پانی کے عناصر شامل ہیں لیکن خدا کی ذات کا کوئی عنصر ہمارے اندر نہیں ہے کہ ہم کچھ اس کا تصور ہی کر سکیں۔ چہ جائیکہ اس کا مشاہدہ کر سکیں۔ رہ گئے وہ لوگ جو مانتے ہیں کہ آخرت میں مشاہدہ ہوگا تو ان سے بحث کرنے کی ضرورت

نہیں ہے، نہ آپ انکار کیجئے نہ اقرار، وہ معاملہ آخرت کا ہے۔

ہمارے صوفی حضرات یہ بات بھی کہتے ہیں کہ انسان پیکر محسوس کا عادی ہے اور پیکر محسوس ہی میں کسی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔ کسی مجرد چیز کا تصور نہیں کرسکتا۔ اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ God کو In person ہونا چاہیے۔ اسی بنیاد پر ان حضرات نے تصور شیخ کا فلسفہ ایجاد کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب آپ خدا کی تجلیات کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو اپنے پیر کو سامنے رکھ کر یہ تصور کیجئے کہ اس میں خدا نے حلول کیا ہوا ہے۔ یہ بعینہ ہندو فلسفہ ہے۔ ہندو یونہی بت پرستی کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے فلسفہ کو چماروں نے نہیں بنایا ہے بلکہ فلسفیوں نے بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیکر محسوس کے بغیر خدا کا تصور نہیں ہوسکتا۔ صوفیوں نے اس کو تصور شیخ کی شکل میں بدل دیا کہ پتھر کے بت بنانے کی ضرورت نہیں، اپنے شیخ کو بت بنالو۔ یہ چیزیں چونکہ اس وقت موجود ہیں اس لیے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل بھی اسی پیکر محسوس کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے اور کہتے تھے کہ اے موسیٰ! تمہارا ان دیکھا خدا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ تم سے بات کرتا ہے ہم سے بات کرے تب ہمیں اطمینان ہوگا۔

اگر پیکر محسوس کے بغیر خدا کا تصور نہیں ہوسکتا تو جب بنی اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ "اجعل لنا الھاً کما لھم الھة" تو حضرت موسیٰ نے اتنے غصہ کا اظہار کیوں کیا تھا۔ اس تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ یہ تعلق بس وحی الٰہی، جبریل امین، اللہ کے کلام اور اس کے پیغام تک محدود ہے۔ خدا کا مشاہدہ اس میں شامل نہیں ہے۔

نئی اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول.

تالیف :- امام حمید الدین فراہیؒ — ترجمہ و ترتیب :- خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن۔ ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80روپے

اصول فہم قرآن

مصنف :- مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب :- عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
  2- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
  3- قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے
  4- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
  5- قرآن قطعی الدلالہ ہے۔
- نسخ اور اس کی حکمت
- حکمت قرآن کے فہم کے لیے اساس

قیمت -/34روپے

اسباق النحو

مصنف :- خالد مسعود

- امام فراہیؒ کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

قیمت -/36روپے

"میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لئے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی"۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث۔ رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور۔
2- دار التذکیر۔ رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔